قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ قَالَ اَوَ لَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ ﴿۸۸﴾

سرداروں نے جنہوں نے اس کی قوم میں سے تکبر کیا کہا اے شعیب ہم تجھ کو اور ان کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے ضرور اپنی بستی سے نکال دیں گے یا تمہیں ہمارے مذہب میں لوٹ آنا ہوگا۔ کہا کیا اس حال میں بھی کہ ہم بیزار ہوں؟[1122]

قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا ؕ وَمَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ؕ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ؕ

یقیناً ہم نے اللہ پر جھوٹ باندھا اگر ہم تمہارے مذہب میں لوٹ آئیں اس کے بعد کہ اللہ نے ہمیں اس سے نجات دی۔ اور ہمیں شایاں نہیں کہ ہم اس میں لوٹ آئیں مگر جو اللہ ہمارا رب چاہے۔[1123] ہمارے رب کا علم تمام

1122 - لَتَعُوْدُنَّ۔ عَوْدٌ کے اصل معنی ہیں ایک چیز سے انصراف یعنی پھر جانے کے بعد اس کی طرف رجوع کرنا۔ خواہ وہ اپنی ذات سے ہو یا محض قول سے یا عزیمت سے۔ (غ) بعض اہل لغت نے عَادَ بمعنی صَارَ بھی لیا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کبھی حالت ضلالت میں نہیں ہوتے۔ چہ جائیکہ ان کی طرف کفر منسوب کیا جا سکے۔ عود کا لفظ محض اس لیے استعمال کیا کہ قوم کی حالت عام طور پر کفر کی تھی یا وہ ایک قومی مذہب تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کفار مِلَّتِنَا کہتے ہیں یعنی اس مذہب کو اپنا مذہب قرار دیتے ہیں اور حضرت شعیب جواب میں مِلَّتِكُمْ کہتے ہیں یعنی تمہارا مذہب۔ اور اس لیے بھی عود کا استعمال جائز ہے کہ یہاں اکیلے حضرت شعیب علیہ السلام کا ذکر نہیں بلکہ ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ کا ذکر بھی ساتھ ہے۔ اور یہ لوگ بلاشبہ حالت کفر سے نکل کر حالت اسلام کی طرف آئے تھے۔ قرآن کریم کی اس دلیل پر کہ جب ہم ایک عقیدہ سے دل سے بیزار ہیں، تو اس کی طرف کیونکر آ سکتے ہیں۔ وہ لوگ غور کریں جو ایسے مہدی کا آنا مانتے ہیں جو تلوار کے زور سے لوگوں کو مسلمان کر لے گا۔ خواہ دل سے وہ ان عقائد کو ناپسند ہی کرتے ہوں۔

1123 - ﴿اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا﴾ ایک طرف تو یہ زور سے کہا کہ ہم کہاں کفر کی حالت میں جا سکتے ہیں۔ دوسری طرف استثناء بھی کیا ہے کہ اگر اللہ چاہے تو جس طرح وہ چاہے ہو۔ اس میں شک نہیں کہ ہر کہ عارف تر است ترساں تر۔ اور انبیاء کا ایمان بھی بین الخوف والرجاء ہوتا ہے کیونکہ وہ بھی بشر ہیں۔ لیکن اصل بات جس کی طرف یہاں توجہ دلائی ہے وہ یہ ہے کہ وہ لوگ حضرت شعیب علیہ السلام کو اور آپ کے ساتھیوں کو باکراہ کفر کی طرف لوٹانا چاہتے ہیں۔ اور مومن سب یکساں نہیں ہوتے بعض حالت اجبار و اکراہ میں نبی کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ اس لیے فرمایا کہ اگر اللہ کو منظور ہے کہ کوئی ان مومنوں میں سے پھر جائے تو جیسا وہ چاہے ورنہ ہم

عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ؕ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَ بَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَ اَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ ﴿۸۹﴾

چیزوں پر حاوی ہے۔ ہم نے اللہ پر بھروسہ کیا۔ اے ہمارے رب ہمارے درمیان اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ (1124)

وَ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۹۰﴾

اور اس کی قوم کے سرداروں نے جو کافر تھے کہا اگر تم نے شعیب کی پیروی کی تو تم یقیناً نقصان اٹھانے والے ہو گے۔

فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۹۱﴾ ع 4

سو ان کو زلزلے نے آ پکڑا، پس وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔

اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۚ اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۹۲﴾

وہ جنہوں نے شعیب کو جھٹلایا گویا کہ وہ وہاں بسے ہی نہ تھے۔ وہ جنہوں نے شعیب کو جھٹلایا وہی نقصان اٹھانے والے ہوئے۔

اپنے اختیار سے تو کبھی پھر نہیں سکتے۔ اور اس اکراہ و اجبار کے ذکر میں بھی مسلمانوں پر جو جبر کیا جاتا تھا اس کی طرف اشارہ ہے اور یہ بھی دوسرے کے ذکر میں بتا دیا کہ مسلمان ہو کر پھر کوئی شخص کفر کی طرف نہیں لوٹ سکتا۔ اور مسلمانوں کے متعلق تاریخی شہادت موجود ہے کہ سوائے ان لوگوں کے جو پہلے منافقت کے طور پر اور اسلام کی دشمنی کو مدنظر رکھتے ہوئے اسلام میں داخل ہوئے۔ مسلمانوں میں سے کوئی لوگ مرتد نہیں ہوئے۔

1124 - افْتَحْ۔ فَاتِحٌ۔ فَتَحٌ کے اصل معنی زنجیروں اور بیڑیوں کا دور کرنا ہیں پھر یہ یا مادی طور پر ہو سکتا ہے یعنی جو آنکھوں سے دیکھا جا سکے جیسے [فَتَحَ الْبَابَ] وغیرہ ﴿وَ لَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ﴾ [یوسف: 65:12] ''اور جب انہوں نے اپنا اسباب کھولا۔'' یا ذہنی طور پر جو بصیرت سے معلوم ہو سکے جیسے ہم وغم کا دور کرنا مال و دولت دے کر ﴿فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ﴾ [الأنعام: 44:6] ''ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے۔'' ﴿لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ﴾ [96] ''تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتیں کھول دیتے۔'' یا علوم کا عطا فرمانا جیسا کہ ﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۙ﴾ [الفتح: 1:48] ''ہم نے تیرے لیے ایک کھلی فتح (کی راہ) کھول دی۔'' میں بعض لوگوں نے مراد لیا ہے کہ مراد اس سے ان علوم و ہدایات کا دیا جانا ہے جو ثواب اور مقام محمود تک پہنچانے کا اور یوں غفر ذنوب کا ذریعہ ہو گئے اور دو شخصوں کے درمیان فتح یا فتح قضیۃ کے معنی ہیں باہمی اختلاف یا جھگڑے کا فیصلہ کر دینا اور یہی معنی یہاں مراد ہیں۔ (غ)

فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَ قَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَ نَصَحْتُ لَكُمْ ۚ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿۹۳﴾ ع 11 9 1

تب اُس نے اُن سے منہ پھیر لیا اور کہا اے میری قوم یقیناً میں نے تم کو اپنے رب کے پیغام پہنچا دیئے اور تمہارا بھلا چاہا سو میں نہ ماننے والی قوم پر کیا افسوس کروں۔ (1125)

وَ مَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ ﴿۹۴﴾

اور ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی نہیں بھیجا مگر اس کے رہنے والوں کو سختی اور دکھ نے پکڑا تا کہ وہ عاجزی اختیار کریں۔ (1125) ل

ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا وَّ قَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَ السَّرَّآءُ فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۹۵﴾

پھر ہم نے دکھ کی جگہ سکھ بدل دیا یہاں تک کہ وہ بڑھ گئے اور کہنے لگے ہمارے باپ دادوں کو بھی دکھ اور خوشی پہنچتے رہے تب ہم نے ان کو اچانک پکڑ لیا اور انہیں خبر بھی نہ ہوئی۔ (1126)

1125 - انبیاء میں غم خواری مخلوق کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے مگر جب حق تبلیغ ادا کر چکے تو اب افسوس کیا کریں جہاں تک ممکن تھا ان کی خیر خواہی کی۔ جب انہوں نے نہ سنا اور نہ مانا تو پھر خدا کی قضا پر رضا کا اظہار کیا۔ اب افسوس کرنے سے کیا فائدہ۔ ہاں جب غم خواری کرنے کا وقت ہوتا ہے تو خطرناک مخالفت کے باوجود غم خواری بھی اس قدر کرتے ہیں اور کفار کی خاطر اس قدر ان کے دل میں درد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝﴾ [الشعرآء: 3:26] شاید تو اپنے آپ کو ہلاک کر دے گا کہ وہ مومن نہیں ہوتے۔

1125ل - يَضَّرَّعُوْنَ۔ اصل يَتَضَرَّعُوْنَ ہے ضَرَعَ اونٹنی بکری وغیرہ کے پستان کو کہتے ہیں اور [ضَرَعَ الْبُهْمُ] کے معنی ہیں چار پایہ کے بچہ نے اپنی ماں کے پستان کو لیا۔ اسی طرح [ضَرَعَ الرَّجُلُ] کے معنی ہیں وہ عاجز ہو گیا۔ (غ) گویا اس میں عاجز ہو کر دوسرے سے قوت حاصل کرتا ہے اور یہی تضرع ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے آگے عاجزی کر کے اس سے طاقت چاہنا۔ انبیاء اور ان کے مخالفین کی چند مثالیں پیش کر کے اب بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قانون اس دنیا میں عذاب کا اس لیے ہے کہ تا دکھوں اور تکلیفوں میں مبتلا ہو کر لوگ عاجزی اختیار کریں اور اللہ کی طرف رجوع کریں۔ گویا وہ بھی بندوں کی بھلائی کے لیے ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے جو عذاب آئے گا وہ محض سزا کے طور پر نہیں بلکہ انسان کی اصلاح اس کی اصل غرض ہے۔ اس لیے دوزخ کا عذاب بھی انسان کی اصلاح کے لیے اور بطور علاج ہی ہو سکتا ہے نہ صرف بطور سزا۔

1126 - عَفَوْا۔ عَفٰی کے معنی نشان کا مٹانا بھی آتے ہیں اور بڑھنا بھی جیسے [عَفَا النَّبْتُ] (غ) یہی معنی یہاں ہیں۔ یعنی ایک دکھ

وَ لَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ وَ لٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۹۶﴾

اور اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتیں کھول دیتے لیکن انہوں نے جھٹلایا تب ہم نے ان کو پکڑ لیا اس کی سزا جو وہ کماتے تھے۔

اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا وَّ هُمْ نَآئِمُوْنَ ﴿۹۷﴾

تو کیا بستیوں والے نڈر ہیں کہ ہمارا عذاب ان پر رات کے وقت آئے جب وہ سوتے ہوں۔

اَوَ اَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّ هُمْ يَلْعَبُوْنَ ﴿۹۸﴾

اور کیا بستیوں والے نڈر ہیں کہ ہمارا عذاب ان پر دن چڑھے آئے جب وہ کھیلتے ہوں۔[1127]

اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ ۚ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۹۹﴾ ع 12 6 2

سو کیا وہ اللہ کی تدبیر سے نڈر ہیں تو اللہ کی تدبیر سے کوئی نڈر نہیں ہوتا مگر وہی لوگ جو گھاٹے میں رہنے والے ہیں۔

اَوَ لَمْ يَهْدِ لِلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ اَهْلِهَاۤ اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ ۚ وَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

کیا ان کے لیے کھل نہیں گیا جو اس کے (پہلے) رہنے والوں کے بعد زمین کے وارث ہوئے کہ اگر ہم چاہیں تو ان کے گناہوں کی وجہ سے انہیں پکڑ لیں اور ہم ان کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں سو وہ نہیں سنتے۔

جب ایک قوم پر آتا ہے اور وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھاتی بلکہ الٹا حق کے ساتھ عناد کرنے میں ترقی کرتی ہے تو پھر نتیجہ اس کا تباہی ہوتی ہے تاکہ کوئی دوسری قوم اس کی جگہ لے۔

1127 - پہلی آیت میں نائم یا سونے والوں سے اور دوسری میں کھیلنے والوں سے مراد غافل اور دنیا کے لہو ولعب میں مشغول اور حقیقت زندگی سے بے خبر لوگ بھی ہو سکتے ہیں۔ اس میں عرب والوں کو صاف تنبیہ ہے۔

تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا ۚ وَ لَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۱﴾

یہ بستیاں ان کے کچھ حالات ہم تجھ پر بیان کرتے ہیں اور یقیناً ان کے رسول ان کے پاس کھلی دلائل لے کر آئے مگر وہ ایسے نہ تھے کہ اس پر ایمان لاتے جس کو پہلے جھٹلا چکے تھے۔ اسی طرح اللہ نہ ماننے والوں کے دلوں پر مہر لگاتا ہے۔[1127]

وَ مَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ ۚ وَ اِنْ وَّجَدْنَاۤ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ ﴿۱۰۲﴾

اور ہم نے ان میں سے بہتوں میں عہد (کا نباہ) نہ پایا اور یقیناً ہم نے ان میں سے بہتوں کو نافرمان پایا۔[1128]

1127- يَهْدِ۔ [هدَيْتُ لَكَ] کے معنی ہیں [بَيَّنْتُ لَكَ] یعنی ایک امر کو واضح کر دیا۔ (ل) اور یہاں اس کا استعمال بمنزلہ لازم کے ہے۔

يَطْبَعُ۔ طَبَعَ اصل میں یہ ہے کہ کسی شے کو کوئی سی صورت دی جائے اور یہ ختم سے عام اور نقل سے خاص ہے اور طَبِيْعَةٌ گویا نفس پر کسی صورت کا نقش ہونا ہے۔ خواہ وہ پیدائش کی وجہ سے ہو یا عادت سے اور پیدائش کے لحاظ سے اغلب ہوتا ہے اور طَبَعَ اور خَتَمَ ایک ہی طرح پر ہیں۔ اور بعض نے طبع کے معنی دَنَس لیے ہیں یعنی اسے زنگ آلود کر دیا جیسے فرمایا ﴿بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ [المطففين: 14:83] ''بلکہ ان کے دلوں پر زنگ بیٹھ گیا ہے۔'' (غ)

مہر لگانے سے مراد:

یہاں صفائی سے بتایا کہ پہلے انسان گناہ کرتا ہے تب خدا کی طرف سے مہر لگتی ہے اور خود لفظ طبع کا استعمال یہی بتاتا ہے کیونکہ ایک خاص صورت کا نقش کرنا ہے اور جس طرح عادت طبیعت ثانیہ ہو جاتی ہے یہی حالت گناہ کی ہے جب انسان بار بار گناہ کرتا ہے تو اس کا ایک نقش دل پر ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ بکثرت اس کو دہرانے سے ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ بوجہ عادت کے طبیعت کا ایک جزو ہو جاتا ہے اور مہر لگانا یہی ہے کہ جب انسان جھٹلا دیتا ہے تو پھر ایمان لانے کی توفیق نہیں ملتی۔ جھٹلانا حق کی مخالفت پر کھڑا ہو جانا ہے اور مخالفت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اس کے کسی اچھے پہلو کی طرف توجہ ہی نہیں کرتا بلکہ سارا زور اس کے نیست و نابود کرنے پر لگاتا ہے۔ اس لیے دل کی حالت ایسی ہو جاتی ہے کہ پھر ایمان کی طرف اس کا میلان ہی نہیں ہوتا۔ پس یہی خدا کی مہر ہے۔

1128- عَهْدٍ سے مراد یا تو عام ہے یعنی جب کبھی وہ کوئی عہد کرتے ہیں اس کو پورا نہیں کرتے۔ جو انسان کسی عہد کا پابند نہیں ہوتا وہ انسانیت کے اعلیٰ مقصد کو کبھی حاصل نہیں کر سکتا۔ اور یا عَهْدٍ سے مراد عہد فطرت ہے یعنی جو کچھ ان کی فطرت میں مرکوز ہے اس

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَاۤ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهٖ فَظَلَمُوْا بِهَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۰۳﴾

تب ہم نے ان کے پیچھے موسیٰ کو اپنی آیات کے ساتھ فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجا مگر انہوں نے ان کا انکار کیا۔ تو دیکھ فساد کرنے والوں کا انجام کیسا ہوا؟(1129)

وَ قَالَ مُوْسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ۙ

اور موسیٰ نے کہا اے فرعون! میں جہانوں کے رب کی طرف سے رسول ہوں۔

حَقِيْقٌ عَلٰۤى اَنْ لَّاۤ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۰۵﴾ؕ

اس پر قائم کہ اللہ پر سوائے حق کے کچھ نہ کہوں۔ میں تمہارے پاس تمہارے رب سے کھلی دلیل لایا ہوں۔ سو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے۔(1130)

پر وہ قائم نہیں رہتے۔ یہاں تک کہ وہ نور فطرت بجھ جاتا ہے۔ دوسرے معنی قابل ترجیح ہیں۔

1129- درمیان میں بہت سے انبیاء علیہم السلام کا ذکر چھوڑ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر شروع کیا ہے اور اس کو بڑی شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے جس کی وجہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کئی ایک امور میں مماثلت کا ہونا ہے۔ کیونکہ آپ [استثناء: 18:18] کی مثل والی پیشگوئی کا مصداق ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر قرآن کریم میں ذیل کے مقامات پر آتا ہے:

[البقرة: 49:2-71]،[النسآء: 153:4]،[المآئدة: 20:5-26]، [الأعراف: 103:7-156]،[يونس:75:10-92]، [هود: 96:11-99]،[بنی إسرائيل: 101:17-104]،[الكهف: 60:18-82]،[مريم:51:19-53]، [طٰهٰ:9:20-98]،[المؤمنون: 45:23-49]،[الشعرآء: 10:26-68]،[النمل: 7:27-14]،[القصص:3:28-48]، [الصافات: 114:37-122]،[المؤمن: 23:40-55]،[الزخرف: 46:43-56]،[الدخان: 17:44-33]، [الذاريات: 38:51-40]،[الصف: 5:61]،[النازعات: 15:79-26]۔

1130- حَقِيْقٌ بمعنی جَدِيْرٌ ہے یعنی سزاوار اور عَلٰى بمعنی ب یعنی اس بات کا اہل ہوں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اصل کام فرعون کو تبلیغ کرنا نہ تھا بلکہ بنی اسرائیل کو فرعون سے چھڑانا۔ کیونکہ وہ مبعوث صرف اپنی قوم کے لیے ہوئے تھے جیسا کہ فرمایا ﴿اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾ [إبراهيم: 5:14] ''اپنی قوم کو اندھیرے سے روشنی کی طرف نکال لا'' اسی لیے سب سے پہلے انہوں نے اس بات کو پیش کیا ہے کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے۔ ہاں جب ان کا

قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۰۶﴾

اس نے کہا اگر تو کوئی نشان لایا ہے تو وہ لے آ اگر تو سچا ہے۔

فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۰۷﴾

تب اُس نے اپنا عصا ڈالا تو ناگہاں وہ صریح اژدھا تھا۔

وَّ نَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ ع 13 9 3

اور اپنا ہاتھ باہر نکالا تو ناگہاں وہ دیکھنے والوں کے لیے سفید تھا۔(1131)

واسطہ فرعون سے پڑنا ضروری تھا تو فرعون کو نصیحت بھی ضروری تھی یہ بھی انہوں نے کی۔

1131- عصا کے لیے [دیکھو نمبر: 88] اور بَيْضَآءُ کے معنی سفید یا روشن اور [اَلْيَدُ الْبَيْضَآءُ] کے معنی ہیں [اَلْحُجَّةُ الْمُبْرَهَنَةُ] (ل) یعنی روشن یا واضح دلیل۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ان دونوں معجزات کا ذکر بائبل میں بھی ہے۔ ان دونوں معجزات کا ظہور دو دفعہ ہونا قرآن شریف اور بائبل میں بھی مذکور ہے۔ یعنی ایک اس موقعہ پر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو رسالت کے عہدہ پر ممتاز کیا جاتا ہے اور دوسرا فرعون کے سامنے جب پہلے گئے ہیں تو اس وقت ان معجزات کا ظہور ہوا۔ البتہ بائبل میں دوسرے موقعہ پر یعنی فرعون کے سامنے ید بیضاء کے معجزہ کا ذکر نہیں جو صریحاً تحریف ہے اس لیے کہ [خروج: 8:4] میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خداوند کا یہ ارشاد ہے کہ ''اگر وے تجھ پر ایمان نہ لاویں اور نہ پہلے معجزہ کے سننے والے ہوں تو وے دوسرے معجزہ کے معتقد ہوں گے۔'' علاوہ ازیں دوسرے معجزہ کا دینا بے معنی تھا اگر فرعون کے سامنے اس کا اظہار نہ ہونا تھا۔

حضرت موسیٰؑ کے معجزات کا پہلا ظہور کن حالات میں ہوا:

البتہ یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ معجزہ کا ظہور عموماً اعدائے حق کے مقابلہ میں ہوتا ہے اور انہی کو عاجز کرنا مقصود ہوتا ہے لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پہلے یہ معجزات اس وقت دکھائے جاتے ہیں جب وہ اکیلے اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہیں اور جب ان پر وہ حالت طاری ہے جس حالت میں اللہ تعالیٰ کا کلام انبیاء علیہم السلام سے ہوتا ہے، یہ حالت جیسا کہ احادیث صحیحہ اس پر شاہد ہیں خاص حالت ہوتی ہے، جس میں نبی ایک امر کو دیکھتا ہے اور ایک آواز کو سنتا ہے، مگر پاس بیٹھنے والے اسے نہیں دیکھتے اور نہ سنتے ہیں۔ چنانچہ احادیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بعض وقت حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اصحاب میں بیٹھے ہوتے تھے جب آپ پر حالت وحی وارد ہوتی اور آپ کی حالت بدل جاتی اور فرشتہ آپ کے سامنے آتا اور آپ سے کلام کرتا۔ مگر فرشتہ کو پاس بیٹھے ہوئے صحابہ نہ دیکھتے۔ نہ ہی وہ فرشتہ کی آواز سنتے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دیکھتے اور سنتے بھی۔ پس اس حالت میں بھی جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمکلام تھے ان معجزات کا ظہور ایک کشفی رنگ رکھتا ہے۔ ہاں فرعون کے سامنے بھی ان معجزات کا ظہور ہوا ہے لیکن بعض اوقات کشفی نظارہ کے دیکھنے میں دوسرے لوگوں کو بھی اللہ تعالیٰ اپنے تصرف تام سے شریک کر دیتا ہے

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۹﴾

فرعون کی قوم کے سرداروں نے کہا یقیناً یہ کوئی دانا جادوگر ہے۔(1132)

يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ ۚ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿۱۱۰﴾

چاہتا ہے کہ تمہیں تمہارے ملک سے نکال دے سو تم کیا مشورہ دیتے ہو؟(1133)

اور یہی اعجاز ہے۔ ورنہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سونٹے میں یہ خاصیت نہ تھی کہ جب زمین پر ڈالیں تو اژدہا بن جائے، نہ ہی سوائے ان دونوں موقعوں کے اور کبھی دشمن کے بالمقابل بھی اس کے اژدھا بننے کا ذکر ہے۔ وہ ایک معمولی سونٹا تھا۔ جیسا کہ خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کے الفاظ میں کہ میں اس پر ٹیک لگاتا ہوں اور بکریوں کے لیے اس سے پتے جھاڑتا ہوں اور اَور کام بھی لے لیتا ہوں۔ کہاں سے وہ سونٹا آیا تھا اس کے متعلق کوئی صحیح اور معتبر روایت پیش نہیں کی جاسکتی۔

ہاں عصا کے اژدہا بننے اور ید بیضا کے ایک اور معنی بھی تھے۔ یعنی اول میں یہ اشارہ تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیروؤں کی جماعت (کیونکہ عصا کا لفظ جماعت پر بھی بولا جاتا ہے [دیکھو نمبر: 88]) اپنے فریق مخالف پر غالب آئے گی اور ید بیضا میں اشارہ حضرت موسیٰ کی دلائل نیرہ کی طرف تھا جو دلوں کو کھا جائے گی۔ چنانچہ فرعونیوں کا غرق ہونا اور ساحروں کا حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانا ان دونوں معجزوں کی اصل حقیقت پر شاہد ہے۔

1132- سَاحِرٌ۔ سَحَّارٌ کرنے والا۔ اور سَحَّارٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 129]۔ لسان العرب میں ہے کہ سِحْرٌ وہ افسون ہے جو آنکھ پر قبضہ کر لیتا ہے یہاں تک کہ یہ گمان ہوتا ہے کہ اصل بات اسی طرح ہے جس طرح وہ دیکھ رہا ہے۔ حالانکہ فی الحقیقت ایسا نہیں اور پھر لکھا ہے کہ سِحْرٌ افسون ہے اور ہر ایک چیز جس کا ماخذ لطیف اور دقیق ہو وہ سَحَّارٌ ہے۔ اور پھر لکھا ہے کہ سَحَّارٌ نہایت درجہ کی ذہانت کا بیان ہے۔ اور حدیث [إِنَّ مِنْ الْبَيَانِ لَسِحْرًا] (صحيح البخاری، كتاب الطب ، باب مِنَ الْبَيَانِ سِحْرًا ، حديث:5767) کو پیش کیا ہے۔ جس کے معنی ابوعبیدہ نے یوں کیے ہیں کہ ایک شخص کسی کی تعریف کرے یہاں تک کہ اپنی صداقت کا لوگوں کو قائل کر لے پھر مذمت کرے یہاں تک کہ لوگوں کو اپنی صداقت کا قائل کر لے۔ اور ابن الاثیر نے اس کے معنی کیے ہیں کہ وہ سامعین کے دلوں کو اپنی طرف پھیر لیتا ہے گو سچ نہ بھی ہو۔ (ل) [اَلسَّاحِرُ، اَلْعَالِمُ الْفَطِنُ] یعنی بڑے ذہین عالم کو ساحر کہا جاتا ہے۔ (ت)

انبیاء علیہم السلام کو ان کے مخالف کیوں ساحر کہتے تھے؟ صرف اسی وجہ سے کہ ان کی باتوں کا اثر دلوں پر ہوتا تھا اور وہ دلوں کو پھیر دیتے تھے۔

1133- تَاْمُرُوْنَ۔ امر سے ہے اور اِئْتِمَارٌ مشورہ کو کہتے ہیں اور یہاں تَاْمُرُوْنَ اسی مشورہ کے معنی میں ہے۔ ﴿فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ﴾ فرعون کا قول ہے جو ان کی بات سن کر کہا گیا ہے جیسا کہ سیاق عبارت سے ظاہر ہے۔

قَالُوْۤا اَرْجِهْ وَ اَخَاهُ وَ اَرْسِلْ فِي الْمَدَآىِٕنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۱۱۱﴾

بولے اسے اور اسے بھائی کو ڈھیل دے اور شہروں میں نقیب بھیج دے۔

يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِيْمٍ ﴿۱۱۲﴾

وہ تیرے پاس ہر دانا جادوگر کو لے آئیں۔ (1134)

وَ جَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْۤا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۱۱۳﴾

اور جادوگر فرعون کے پاس آئے کہنے لگے ہم کو اجر تو ضرور ملے گا اگر ہم ہی غالب رہے۔

قَالَ نَعَمْ وَ اِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

کہا ہاں! اور تم یقیناً (میرے) مقربوں میں سے ہو گے۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰۤى اِمَّاۤ اَنْ تُلْقِيَ وَ اِمَّاۤ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾

انہوں نے کہا اے موسیٰ یا تو تُو ڈال یا ہم (پہلے) ڈالنے والے ہوں۔

قَالَ اَلْقُوْا ۚ فَلَمَّاۤ اَلْقَوْا سَحَرُوْۤا اَعْيُنَ النَّاسِ وَ اسْتَرْهَبُوْهُمْ وَ جَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۱۶﴾

کہا ڈالو، سو جب انہوں نے ڈالا لوگوں کی آنکھوں کو دھوکا دیا اور ان کو ڈرایا اور ایک بڑا فریب بنا کھڑا کیا۔ (1135)

1134 - اَرْجِهْ۔ اصل میں اَرْجِئْهُ ہے اور اَرْجَاءٌ کسی معاملہ کو توقف یا تاخیر میں ڈال دینے کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ فوراً ان کے معاملہ میں کارروائی نہ ہو جو اس علم کے ماہر ہیں وہ سب جمع ہو کر مقابلہ کریں۔

1135 - **حضرت موسیٰؑ کا ساحروں سے مقابلہ اور ان کی رسیاں اور سونٹیاں:** وہ کیا چیز تھی جو انہوں نے ڈالی؟ دوسری جگہ آتا ہے ﴿حِبَالَهُمْ وَ عِصِيُّهُمْ﴾ [الشعرآء: 44:26] ان کی رسیاں اور ان کی سونٹیاں۔ آیا یہ سچ مچ کی رسیاں اور سونٹیاں تھیں۔ حبل ہر ایک ذریعہ کو کہا جاتا ہے اس لیے اس سے مراد اس قدر ہو سکتی ہے کہ جو ان سے بن پڑا اور عصا کا استعمال مجاز کے رنگ میں ہوا ہے مثلاً [قَرْعَهُ بِعَصَا الْمَلَامَةِ] کے لفظی معنی اس کو ملامت کے سونٹے سے مارا۔ مگر مراد صرف یہ ہے کہ خوب ملامت کی۔ ایسا ہی [قَشَرْتُ لَهُ الْعَصَا] کے لفظی معنی ہیں میں نے اس کے لیے سونٹے کا چھلکا اتارا اور مراد ہے کہ جو کچھ میرے دل میں تھا زبان سے ظاہر کر دیا۔ اور تاج العروس میں العصا کے معنی اللسان یعنی زبان بھی دیئے ہیں۔ پس ممکن ہے کہ کوئی رسیاں اور سونٹیاں وہ ساتھ لائے ہوں اور ان کو ڈالا ہو اور ممکن ہے کہ مراد اس سے صرف باطل کی حمایت میں جھوٹے سامان اور جھوٹی تقریریں ہوں۔ ﴿مَا يَاْفِكُوْنَ﴾ سے جو آگے آتا ہے دوسرے خیال کی تائید ہوتی ہے۔ اور دوسری جگہ انہی

وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ﴿۱۱۷﴾

اور ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ تو اپنا سونٹا ڈال۔ پس وہ فوراً اسے نگل گیا جو وہ جھوٹ بناتے تھے۔(1136)

واقعات کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے ﴿فَحَشَرَ فَنَادٰى ۝ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ۝﴾[النازعات: 79:23-24] یعنی ''لوگوں کو اکٹھا کیا اور یہ اعلان کیا کہ میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں۔'' جو اسی موقعہ کا ذکر ہے۔ گویا ساحروں سے یہ اعلان کرایا کہ وہی سب سے بڑا دیوتا ہے اور اس کے سوا کوئی خدا نہیں ﴿مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ﴾[القصص: 28:38] ''میں تمہارے لیے اپنے سوائے کوئی معبود نہیں جانتا۔'' اور اس کے بالمقابل حضرت موسیٰ علیہ السلام یوں فرماتے ہیں ﴿فَلَمَّآ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ وَ يُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝﴾ [یونس: 10:81-82] یعنی ''جو کچھ تم لائے ہو یہ تو سحر ہے اور اللہ اس کو یوں باطل کر دے گا کہ اپنے کلمات کے ساتھ حق کو حق دکھائے گا۔'' پس یہ تمام امور اس کے مؤید ہیں کہ ایک طرف سے فرعون کی خدائی پر زور دیا جاتا تھا، دوسری طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی ہستی پر دلائل دیں۔ لیکن ظاہر الفاظ کو بھی اگر لیا جائے اور واقعی لوگوں کو مرعوب کرنے کے لیے فرعون نے چالاک آدمیوں سے کچھ فریب کاری اس قسم کی کرائی ہو جس سے لوگوں کو خیال ہو جائے کہ فرعون میں کچھ خدائی ہے تو یہ امر بھی بالکل قرین قیاس ہے کیونکہ عموماً مشرک قومیں توہم پرست بھی بہت ہوتی ہیں۔ جو لوگ ہواؤں اور بجلیوں اور بارشوں اور آگ اور درختوں اور پتھروں اور جانوروں کے سامنے سر جھکا دیتے ہوں ان کو اس قسم کی شعبدہ بازی سے مرعوب کر لینا بہت آسان ہوتا ہے۔ پس فرعون نے بڑے بڑے دانا آدمیوں کو اکٹھا کر کے ان سے کوئی اس قسم کی شعبدہ بازی کرائی اور اس خاص طرز کو ممکن ہے انہوں نے اس لیے اختیار کیا کہ فرعون کے سامنے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کے اژدھا بننے کا معجزہ مشہور ہو چکا تھا۔ انہوں نے سمجھا یہ کوئی چالاکی ہے ہم بھی اسی قسم کی چالاکی سے کام نکال لیں گے۔ مگر اس کا پول حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کھول دیا جس کا ذکر اگلی آیت میں ہے۔

1136 - تَلْقَفُ۔ لَقْفٌ کے معنی ہیں ایک چیز کو دانائی سے لے لینا خواہ منہ سے ہو یا ہاتھ سے۔ (غ)

يَاْفِكُوْنَ۔ اِفْكٌ حق سے باطل کی طرف پھیرنے کو کہتے ہیں۔ اس لیے ہر چیز کو جو اس حالت سے پھری ہوئی ہو جس پر اسے ہونا چاہیے افک کہا جاتا ہے۔ اسی لیے افك مطلق کذب کو بھی کہتے ہیں ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ﴾[النور: 24:11] ''جو جھوٹ بنا لائے۔'' (غ)

ساحروں کی سونٹیاں اور عصائے موسیٰ:

یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا میں یہ صفت نہ تھی کہ جب ڈالا جائے تو اژدھا بن جائے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے خود ڈالنے کی جرأت بھی نہیں کی، جب تک کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نہیں ہوئی۔ عصا کے ڈالنے کا نتیجہ کیا ہوا؟ جو کچھ ساحروں نے افک یا جھوٹ بنایا تھا یا جو حق کو باطل سے پھیرا تھا اس کو وہ عصا کھا گیا اور ان کا کچھ باقی نہ رہنے دیا۔

فَوَقَعَ الْحَقُّ وَ بَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

سوحق ظاہر ہوگیااور جو وہ کرتے تھے باطل ہوگیا۔

فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَ انْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

پس وہاں ہار گئے اور ذلیل ہو کر پھرے۔

وَ اُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ﴿۱۲۰﴾

اور جادوگر سجدے میں گر گئے۔

قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۱﴾

کہا ہم جہانوں کے رب پر ایمان لائے۔

رَبِّ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

موسیٰ اور ہارون کے رب پر۔ (1137)

قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ؕ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَاۤ اَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

فرعون نے کہا تم اس پر ایمان لائے قبل اس کے کہ میں تم کو اجازت دوں۔ یہ ایک حیلہ ہے جو تم نے اس شہر میں بنالیا ہے تاکہ اس کے رہنے والوں کو اس سے نکال دو سو تم (نتیجہ) جان لو گے۔

کس طرح پر ہوا؟ اس کی تفصیل قرآن شریف میں نہیں نہ کہیں یہ ذکر ہے کہ یہ اژدھا بن گیا تھا، نہ یہ ذکر ہے کہ ان کی سونٹیاں سانپ بن گئی تھیں۔ صرف اس قدر ذکر ہے کہ ان کے سحر سے وہ دوڑتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب عصا ڈالا تو وہ ساحروں کے جھوٹ کو کھا گیا اور حق ظاہر ہوگیا۔ اور یہ خیال کہ اژدھا بن کر ہی نگلا ہوگا محض خیال ہی ہے۔ یہی عصا جب سمندر سے گزرنے کے لیے ضرورت پیش آئی تو وہاں اژدھا نہیں بنا اور جو کچھ ہوا اس کا نتیجہ یہ بتایا ہے کہ ساحر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے اور ان کے اس قول سے کہ ﴿اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا﴾ [126] ''ہم اپنے رب کی باتوں پر ایمان لائیں۔'' یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف عصا کا معجزہ نہ تھا کیونکہ وہ ایک ہی آیت ہوتی اور ایمان درحقیقت معجزات پر نہیں لایا جاتا بلکہ اللہ تعالیٰ کے احکام پر۔ پس کیا بعید ہے کہ ایک بت پرست قوم کے دل اللہ تعالیٰ کی توحید کی دلائل سے کھائے گئے ہوں۔

1137- **ساحروں کا ایمان لانا اور بائبل:** جادوگروں کے ایمان لانے کا ذکر بائبل میں نہیں جہاں اس مقابلہ کا ذکر ہے۔ مگر یہودیوں کی روایات میں یہ ذکر موجود ہے اور اس کی تائید [خروج: 38:12] سے ہوتی ہے جہاں بنی اسرائیل کے مصر سے جانے کے ذکر میں لکھا ہے کہ ''ایک دوسری بڑی گروہ مل جل کر ان کے ساتھ گئی۔'' جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسرائیلیوں کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے تھے اور یہودی انسائیکلو پیڈیا میں ہے'' کیونکہ مصری جب موسیٰ کی پہاڑ سے واپسی کا وقت گزر گیا ان میں سے چالیس ہزار اکٹھے ہو کر آئے دو مصری جادوگروں ینیس اور یمبریس کے ساتھ۔''

لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۲۴﴾

میں ضرور تمہارے ہاتھ اور تمہارے پاؤں مخالف طرف سے کاٹ دوں گا پھر میں ضرور تم کو صلیب کی موت ماروں گا۔

قَالُوْٓا اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۱۲۵﴾ ۚ

انہوں نے کہا ہم اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔

وَ مَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا ؕ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ﴿۱۲۶﴾ ع 14 18 4

اور تو ہم سے دشمنی نہیں کرتا مگر اس لیے کہ ہم اپنے رب کی باتوں پر ایمان لائے جب وہ ہمارے پاس آ گئیں۔ اے ہمارے رب ہم پر صبر ڈال اور ہمیں مسلمان مار۔ (1138)

وَ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَ قَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ وَ وَيَذَرَكَ وَ اٰلِهَتَكَ ؕ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَ نَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ۚ وَ اِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾

اور فرعون کی قوم کے سرداروں نے کہا کیا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو چھوڑتا ہے کہ ملک میں فساد کریں اور وہ تجھے اور تیرے معبودوں کو چھوڑ دے؟ اس نے کہا ہم ان کے بیٹوں کو قتل کر دیں گے اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھیں گے اور ہم ان پر غالب ہیں۔

قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَ اصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۫ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۲۸﴾

موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو۔ زمین اللہ کی ہے وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے اور (اچھا) انجام متقیوں کے لیے ہے۔ (1139)

اور ینیس اور یمبریس وہی جادوگر تھے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ پر آئے جیسا کہ [2 تمطاؤس: 8:3] سے ظاہر ہے۔

1138 - مومن اور کافر میں یہ فرق دکھایا ہے کہ یہی جادوگر جو حالت کفر میں روپوں کا اجر فرعون سے طلب کرتے تھے اب جان تک کی ان کو پروا نہیں۔ اس لیے کہ خدا کو پالیا۔

1139 - **بنی اسرائیل کے ذکر میں مسلمانوں کی مشکلات کا علاج:** قرآن کریم نے جن گزشتہ واقعات کو بیان کیا ہے ان سب میں اور بالخصوص بنی اسرائیل کے ذکر میں اسلام کی تاریخ لکھی ہوئی ہے جو کچھ حالت بنی اسرائیل کو پیش آئی وہی مسلمانوں کو پیش

قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ؕ قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ

انہوں نے کہ ہمیں دکھ دیا گیا اس سے پہلے کہ تو ہمارے پاس آتا اور اس کے بعد کہ تو ہمارے پاس آیا۔ اس نے

آنے والی تھی۔ اس لیے بنی اسرائیل کے واقعات کا ذکر کر کے جو ان کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی معرفت علاج بتایا ہے وہ مسلمانوں کی مشکلات کا علاج ہے۔ بنی اسرائیل ایک دوسری قوم کی غلامی میں تھے اور دوسری قوم ان پر حکمران تھی۔ حاکم قوم ان کو روز بروز کمزور کرتی چلی جاتی تھی اور ایسی تدابیر ان کے متعلق اختیار کرتی تھی کہ جن سے ان کی قومی زندگی مٹتی چلی جائے۔ سب ذلت کے کام ان سے لیے جاتے تھے۔ ان کے بیٹوں کو قتل کیا جاتا اور عورتوں کو زندہ رکھا جاتا تھا تا کہ یہ قوم آہستہ آہستہ فنا ہو جائے۔ آج یہی نقشہ مسلمانوں کا نظر آتا ہے صرف اس قدر فرق ہے جو حالات زمانہ سے پیدا ہونا لازم تھا۔ آج مسلمان عموماً ساری دنیا میں اور بالخصوص اس ملک ہند میں ایک دوسری قوم کی غلامی میں ہیں۔ وہ دوسری قوم ان پر حکمران ہے اور حکومت کی تدابیر اس قدر مضبوط ہیں کہ محکوم قوم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ محکوم قوم کے اعلیٰ درجہ کے جوہر مٹتے چلے جا رہے ہیں۔ دنیا کے مال کے لالچ کے لیے وہ دین ایمان بیچتے چلے جاتے ہیں۔ شجاعت اور مردانگی کا جوہر مفقود ہوتا چلا جاتا ہے۔ دین اسلام کی محبت اور غیرت کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ دنیوی شان و شوکت تو مدت سے رخصت ہو چکی جو کچھ باقی رہی تھی اس کا اس جنگ نے فیصلہ کر دیا۔ ہاں وہاں اگر بیٹوں کو قتل کرتے تھے تو یہاں مجازی طور کا قتل ہے کیونکہ مردانگی اور شجاعت کی اعلیٰ صفات کا مرجانا یہی مجازاً قوم کے فرزندوں کا قتل ہے۔ آرائش و زیبائش جسمانی مال و دولت دنیا، دنیا کی دلفریبی کے ظاہری سامانوں پر فریفتگی یہ وہ زنانہ صفات ہیں جو ﴿وَ نَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ﴾ کے قائم مقام ہو رہی ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ ان مشکلات کا علاج کیا ہے۔ اگر یہ سچ ہے کہ آج ہماری قوم کو بالکل وہی حالات پیش آئے ہیں جو بنی اسرائیل کو فرعون کے ماتحت پیش آئے تھے تو اللہ تعالیٰ نے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے علاج بتایا ہے وہ ہماری مشکلات کا علاج ہے اور وہ علاج کیا ہے ﴿اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَ اصْبِرُوْا﴾ اللہ تعالیٰ کی مدد چاہنا اور صبر اختیار کرنا۔ آج کل کے لیڈروں کی نظر میں یہ ایک لغوی بات ہے وہ اس طرف توجہ نہیں کرتے۔ ان کو اپنی قوت بازو پر بھروسہ ہے کہ ہم اس حاکم قوم کو عدم تعاون سے مار لیں گے اور اگر عدم تعاون سے یہ قوم نہ مری تو پھر ہم تلوار اٹھائیں گے۔ خدا کے کلام کی تصریح کے خلاف ان باتوں کی طرف جانا عمداً قوم کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ فرعون کی اس قدر زیادتیوں کے باوجود، بنی اسرائیل کے بیٹوں کے قتل کرنے کے باوجود، خدا کی عبادت سے روکنے کے باوجود، بنی اسرائیل کو جو ایک محکوم قوم تھی یہ حکم نہیں دیا جاتا کہ تم فرعون کے خلاف جنگ کرو۔ بلکہ یہ حکم دیا جاتا ہے کہ اللہ کی مدد چاہو اور صبر کرو۔ یہی علاج آج ہماری مشکلات کا تھا۔ ہم بنی اسرائیل کی طرح دوسری قوم کی غلامی میں ہیں۔ اس ذلت کی حالت سے ہم حاکم قوم سے جنگ کر کے نہیں نکل سکتے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر کے، خدا کے آگے گر کر اور اپنی کمزوری کا علاج اللہ تعالیٰ کی قوت کو سمجھ کر نکل سکتے ہیں۔ قرآن کریم کا ایک لفظ بھی اس بات کی تائید میں پیش نہیں کیا جا سکتا کہ محکوم ہو کر حاکم قوم کے ساتھ جنگ کرنے کی اجازت دی جائے اور درحقیقت یہ جنگ نہ ہوگی خودکشی ہوگی۔ قوم کے ملکی رہنماؤں کو اور علمائے اسلام کو یہ چاہیے کہ حالات پیش آمدہ میں اپنی مشکلات کا حل قرآن کریم سے سوچیں۔ استعانت باللہ اور صبر سے ہی قوم کے اندر وہ جوہر پیدا ہوں گے جن سے یہ قوم زندہ رہنے کے

يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَ يَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۹﴾ ع 15 3 5

کہا قریب ہے کہ تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور تم کو زمین میں جانشین بنائے پھر دیکھے تم کس طرح عمل کرتے ہو۔ (1139)

وَ لَقَدْ اَخَذْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَ نَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۳۰﴾

اور البتہ ہم نے فرعون کے لوگوں کو قحط اور پھلوں کی کمی میں پکڑا تا کہ وہ نصیحت قبول کریں۔ (1140)

فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَ

سو جب ان کو سکھ پہنچتا کہتے یہ ہمارا حق ہے اور اگر ان کو دکھ پہنچتا موسیٰ اور اس کے ساتھیوں کی شومی بتاتے۔

قابل بنے گی۔ رہا ان لوگوں کا سوال جو اس وقت اسلام کے دشمن ہمیں نظر آتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس پر بھی قادر ہے کہ ان کی ہلاکت کے کوئی اسباب پیدا کر دے اور وہ اس پر بھی قادر ہے کہ ان کو دشمنان اسلام کے حلقہ سے نکال کر حلقہ بگوشان اسلام بنا دے ﴿عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً﴾ [الممتحنة: 7:60] ''قریب ہے کہ اللہ تمہارے اور ان لوگوں کے درمیان جن کے ساتھ ان میں سے تمہاری دشمنی ہے محبت پیدا کر دے۔'' ہمارا فرض یہی ہے کہ ہم اپنی اصلاح کریں اور اسلام کی خوبیوں کو دوسروں کے سامنے کھول کر رکھیں۔ یہی وہ راہ ہے جو حالات پیش آمدہ میں قرآن کریم نے ہمیں صراحت سے بتا دی ہے۔ جب تک مسلمان اس راہ سے منہ موڑ رہے ہیں ذلت و ادبار کی حالت سے باہر نہیں نکل سکتے۔

1139۔ **بادشاہت کے حصول کا طریق:** اس سارے بیان میں یہی بتایا ہے کہ جب ایک قوم حد سے زیادہ مخلوق کو دکھ دیتی ہے تو بادشاہت اس سے لے کر دوسری قوم کو دے دی جاتی ہے۔ باوجود ان سارے دکھوں کے جو بنی اسرائیل کو ملتے ہیں، باوجود اس کے کہ ایک سخت غلامی کی حالت میں وہ پڑے ہوئے ہیں اور حاکم قوم بڑی زبردست ہے اور یہ صرف چند بیگار کے کام کرنے والے لوگ ہیں۔ جن کو حکومت میں بھی کوئی رسوخ حاصل نہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایمان کس قدر ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ تمہارا دشمن ضرور ہلاک ہوگا اور تم بادشاہ بنو گے مگر پھر تمہارے عملوں کو بھی اللہ تعالیٰ دیکھے گا جب تم اس طرح مخلوق خدا کو دکھ دینے لگو گے تو تم سے بھی حکومت لے لی جائے گی۔ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں کی تکالیف میں مسلمانوں کی اس وقت کی تکالیف کا نقشہ کھینچا ہے گو دونوں رنگوں میں کچھ فرق ہو کر دوسری قوموں کے ہاتھ میں یہ لوگ ذلیل اور مقہور ہو رہے ہیں۔

1140۔ سِنِيْنَ۔ سَنَةٌ کی جمع ہے جس کے معنی سال ہیں۔ مگر اس کا زیادہ استعمال قحط کے سال پر ہے۔ (غ) یہاں تک کہ اس سے مراد قحط کا سال ہی سمجھا جانے لگا۔

مَنْ مَّعَہٗ ؕ اَلَاۤ اِنَّمَا طٰٓئِرُھُمْ عِنْدَ اللّٰہِ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۱﴾

سنو ان کی شومی صرف اللہ کی طرف سے ہے لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔(1141)

وَقَالُوْا مَھْمَا تَاْتِنَا بِہٖ مِنْ اٰیَۃٍ لِّتَسْحَرَنَا بِھَا ۙ فَمَا نَحْنُ لَکَ بِمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۳۲﴾

اور انہوں نے کہا جو کوئی نشان بھی تو ہمارے پاس لائے تا کہ اس کے ساتھ ہم کو دھوکا دے تو ہم تیری بات کو نہیں مانیں گے۔(1142)

1141 - یَّطَّیَّرُوْا ۔ طَائِرُہٗ ۔ طَیْرٌ بمعنی پرند سے ہے اور تَطَیَّرَ اور اِطَّیَّرَ پرندوں سے شگون لینے کو کہتے ہیں۔ پھر اس کا استعمال ہر ایک قسم کی بدشگونی اور بری فال لینے پر عام ہوگیا ہے۔ (غ) اہل عرب اگر پرندوں کو بائیں جانب اڑتا دیکھیں تو اسے بدشگونی سمجھتے تھے۔ (ت) اور طٰٓئِرُھُمْ میں طائر سے مراد ان کی شوم یعنی وہ بدقسمتی ہے جس کے متعلق وہ بدشگونی لیتے تھے۔ طائر اصل میں انسان کے عمل کو کہتے ہیں۔ خیر ہو یا شر، کیونکہ وہ اس سے اڑ جاتا ہے جیسا کہ ﴿کُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰہُ طٰٓئِرَہٗ فِیْ عُنُقِہٖ﴾ [بنی إسرائیل: 13:17] ''ہر انسان کے عملوں کو ہم نے اس کی گردن میں ڈالا۔'' (غ) ابوعبیدہ کہتے ہیں حظ یا بہرہ ور جو انسان کو ملے یہ لفظ اطلاق پاتا ہے۔ (ت) ﴿طٰٓئِرُھُمْ عِنْدَ اللّٰہِ﴾ سے مراد ہے کہ جو کچھ ان پر مصیبت آتی ہے وہ ان کا حظ یا بہرہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے یعنی انہی کی بدعملیوں کی سزا ہے۔

مسلمانوں کے مصائب اور مجدد صد چہاردہم:

جب کوئی راستباز آتا ہے اور وہ ایک اچھی راہ کی طرف بلاتا ہے اور بری راہ سے روکتا ہے اور لوگ اس کی بات کو نہ ماننے سے اور مصائب میں مبتلا ہوتے ہیں تو بجائے اس کے کہ اپنی اصلاح کی طرف توجہ کریں اور راہ حق کو قبول کریں یوں کہنے لگتے ہیں کہ یہ مصائب اس شخص کی وجہ سے ہی ہم پر آ رہے ہیں۔ ان کو توجہ دلائی ہے کہ داعی خیر کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کے اپنے اعمال بد کی وجہ سے ان پر مصائب آتی ہیں۔ آج مسلمانوں کا یہی حال ہے جو چودھویں صدی کے سر پر ایک مجدد آیا اور اس نے بتایا کہ تمہاری کامیابی اپنی اصلاح اور اشاعت اسلام میں ہے تو بجائے اس کے کہ اس حق بات کو قبول کرتے اس کی مخالفت کی اور غلط راہوں پر پڑے وہ مصائب اور بھی بڑھیں تو اب لگے کہنے کہ ہماری مصائب تو اس کے آنے سے اور بھی زیادہ ہوئیں۔ کاش مسلمان ان آیات قرآنی سے کچھ سبق لیں۔

1142 - مَھْمَا ۔ مَہْ اور مَا سے مرکب ہے اور مَہْ اسم فعل بمعنی توقف ہے اور ما شرطیہ یا مَامَا سے مرکب ہے۔ پہلا مَا شرطیہ ہے اور دوسرا تعمیم کے لیے۔

مطلب یہ تھا کہ یہ تمہارے معجزات محض دھوکہ ہیں۔ اس لیے ان کو دیکھ کر ہم ایمان نہیں لاتے۔

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَ الْجَرَادَ وَ الْقُمَّلَ وَ الضَّفَادِعَ وَ الدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ فَاسْتَكْبَرُوْا وَ كَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿۱۳۳﴾

سو ہم نے ان پر طوفان اور ٹڈیاں اور جوئیں اور مینڈکیں اور خون الگ الگ نشانیاں بھیجیں۔ مگر انہوں نے تکبر کیا اور وہ مجرم قوم تھے۔ (1143)

وَ لَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَ لَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۚ ﴿۱۳۴﴾

اور جب ان پر عذاب پڑتا کہتے اے موسیٰ! ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کر جیسا اس نے تجھ سے عہد کیا ہے اگر تو ہم سے عذاب اٹھا دے ہم ضرور تجھ پر ایمان لے آئیں گے اور ضرور تیرے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دیں گے۔

فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰۤى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ ﴿۱۳۵﴾

پس جب ہم ان سے ایک وقت کے لیے جس کو وہ پہنچنے والے تھے عذاب اٹھا دیتے تو فوراً عہد شکنی کرتے۔ (1144)

1143 - طُوْفَانَ۔ طَوْفٌ سے ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کے گرد گھومنا اور طوفان ہر وہ حادثہ ہے جو انسان کو چاروں طرف سے گھیر لے۔ (غ) اسی سے اس کا استعمال بڑے سیل پر ہوا ہے۔ طوفان کے معنی بخاری میں موت کثیر دیئے ہیں۔

جَرَادَ۔ ٹڈی کو کہتے ہیں کیونکہ وہ سبزی سے خالی کر دیتی ہے۔ (غ) اور جَرَدَ کے معنی ہیں ایک چیز کا چھلکا اتار دیا۔

قُمَّلَ۔ جوں، چیچڑی، پسو وغیرہ پر بولا جاتا ہے ضَفَادِعَ۔ ضَفْدَعٌ کی جمع ہے مینڈک۔

حضرت موسیٰؑ کے نو نشان:

بائبل میں ذیل کی نشانیوں کا ذکر ہے۔ دریا کا لہو بن جانا، مینڈکوں کی آفت، جوئیں، مچھر، مویشی پر مری، پھوڑوں کی آفت، اولے، ٹڈی، تاریکی۔ قرآن کریم نے جو آفات بیان کی ہیں وہ سات ہیں۔ جن میں پانچ یہاں اور دو [آیت نمبر: 130] میں یعنی قحط اور پھلوں کی کمی اور ان سات کے ساتھ عصا اور ید بیضا کے معجزات ملا کر کل نو نشان ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ دوسری جگہ ذکر ہے۔ [بنی إسرائیل: 101]

1144 - يَنْكُثُوْنَ۔ نَكَثَ کاتے ہوئے اور بنے ہوئے کے توڑنے پر استعمال ہوتا ہے اور استعارۃً نقض عہد پر۔ (غ) [خروج: 8-11] باب تک ان نشانات کی تفصیل اور فرعون کے اقرار و عہد شکنی کا ذکر ہے۔

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ كَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۳۶﴾

پس ہم نے ان پر سزا بھیجی اور ان کو دریا میں غرق کر دیا اس لیے کہ وہ ہماری باتوں کو جھٹلاتے تھے اور ان سے لاپرواتھے۔

وَ اَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَ مَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۙ بِمَا صَبَرُوْا ؕ وَ دَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَ قَوْمُهٗ وَ مَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ﴿۱۳۷﴾

اور ہم نے اس قوم کو جسے کمزور گنا جاتا تھا اس زمین کے مشرقی اور اس کے مغربی حصوں کا وارث کر دیا جس میں ہم نے برکت دی تھی۔ اور تیرے رب کی اچھی بات بنی اسرائیل کے حق میں پوری ہوئی اس لیے کہ انہوں نے صبر کیا۔ اور ہم نے وہ سب تباہ کر دیا جو فرعون اور اس کی قوم کرتے تھے اور جو وہ عمارتیں بناتے تھے۔ (1145)

1145 - اَلْاَرْضِ سے مراد ارض مقدس یعنی شام کی زمین ہے اس کے مشرق و مغرب کا مالک کر دیا۔ یعنی ساری ارض مقدس کا وارث کر دیا۔ گو یہ بہت بعد کا واقعہ ہے۔ ﴿تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى﴾ تمام یا انتہا کو پہنچ جانے سے مراد اس کا پورا ہونا ہے۔ اور [كَلِمَةُ الْحُسْنٰى] یا اچھی بات وہ وعدہ ہے جو ان کو دیا گیا تھا کہ تمہیں ارض مقدس کا وارث بنایا جائے گا یا اس وعدہ کی طرف اشارہ ہے جو اوپر فرمایا ﴿عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ﴾ [129] ''قریب ہے کہ تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے۔''

يَعْرِشُوْنَ - کے معنی ابوعبیدہ نے يَبْنُوْنَ کیے ہیں یعنی جو عمارتیں وہ بناتے تھے۔ (غ) یا باغات مراد ہو سکتے ہیں۔

اس امت کی کامیابی تلوار سے نہیں:

یہاں بنی اسرائیل کو ان کے صبر کا نتیجہ بتایا۔ اور حسن سے مروی ہے کہ اگر لوگ جب ان کو اپنے بادشاہ کی طرف سے کسی قسم کی تکلیف پہنچے صبر کریں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کریں تو بہت دیر نہ لگے گی کہ اللہ تعالیٰ اس مصیبت کو دور کر دے گا لیکن وہ گھبرا کر تلوار کی طرف جاتے ہیں۔ سواسی کے سپرد کیے جاتے ہیں اور انہی سے روایت ہے کہ بنی اسرائیل کو جو کچھ ملا ان کے صبر سے ہی ملا۔ اور یہ امت جب تلوار کی طرف دوڑے گی تو کبھی نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ (ر) ان روایت کو نقل کر کے مصنف روح المعانی لکھتے ہیں کہ ہم نے لوگوں کو 1248 سال تک دیکھا کہ وہ جب تلوار کی طرف دوڑے ہیں تو ان کو اس سے کچھ فائدہ نہ ہوا، نہ ان کی مراد پوری ہوئی نہ کوئی محمود امر ہوا۔

وَجٰوَزْنَا بِبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰی قَوْمٍ یَّعْكُفُوْنَ عَلٰۤی اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا یٰمُوْسَی اجْعَلْ لَّنَاۤ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ؕ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

اور ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے گزار دیا۔ تب وہ ایک قوم پر آئے جو اپنے بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ بولے اے موسیٰ! ہمیں بھی ایک دیوتا بنا دے جیسے ان کے دیوتا ہیں۔ اس نے کہا تم لوگ جہالت کرتے ہو۔ (1146)

اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِیْهِ وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۹﴾

یہ جس کام میں لگے ہوئے ہیں وہ تباہ ہونا ہے اور جو وہ کرتے ہیں باطل ہے۔ (1147)

1146 - اَصْنَامٍ۔ صَنَمٌ کی جمع ہے اور وہ جسم ہے جو چاندی، تانبے، لکڑی وغیرہ سے بنایا جائے۔ ان کی عبادت کرتے تھے اس خیال سے کہ اللہ تعالیٰ کا قرب اس سے حاصل ہوتا ہے اور بعض نے صنم سے مراد ہر اس چیز کو لیا ہے جس کی من دون اللہ پرستش کی جائے۔ بلکہ ہر چیز جو اللہ تعالیٰ سے دوسری طرف لے جانے والی ہو۔ (غ)

بنی اسرائیل پر مصریوں کا اثر:

مصری لوگ ہر چیز کی پرستش کرتے تھے اس قسم کی بت پرست قوم میں رہ کر بنی اسرائیل کی عادات میں بت پرستی داخل ہو گئی تھی اس لیے بار بار بت پرستی کی طرف ان کا میلان پایا جاتا ہے۔ ہندوستان میں بھی مسلمانوں پر ہمسایہ قوم کا اثر بہت ہوا ہے یہاں تک کہ قبر پرستی، پیر پرستی کے رنگ میں طرح طرح کے مشرکانہ عقیدے ان میں پھیل گئے ہیں اور ہر قسم کی مشرکانہ رسوم و رواج ان میں جڑ پکڑ گئے ہیں۔

1147 - مُتَبَّرٌ۔ تَبَّرٌ اس سونے یا دوسری معدنی چیز کو کہتے ہیں جو ٹوٹی ہوئی حالت میں یعنی ذرات کی صورت میں مٹی میں ملی ہوئی ہو اور تَبَّرَهٗ کے معنی ہیں ایک چیز کو توڑ دیا اور ہلاک کر دیا۔ پس مُتَبَّر کے معنی توڑ کر ہلاک کر دیا گیا۔ اور تَبَار ہلاکت ہے ﴿وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِیْنَ اِلَّا تَبَارًا﴾ [نوح:28:71] ''اور ظالموں کی ہلاکت ہی بڑھائیو۔'' ﴿كُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِیْرًا﴾ [الفرقان: 39:25] ''سبھی کو ہم نے ہلاکت کو پہنچایا۔''

﴿مَا هُمْ فِیْهِ﴾ جس معاملہ میں یہ ہیں یعنی بت پرستی یا ان بتوں کو حصول قرب بارگاہ الٰہی کا ذریعہ خیال کرنا بالفاظ دیگر مذہب بت پرستی آخر کار دنیا سے اٹھ جائے گا۔ اب تک دنیا کی تاریخ سے اس پر شہادت ملتی ہے کہ بت پرستی کا مذہب دنیا میں علم کی ترقی کے ساتھ ساتھ کمزور ہوتا چلا گیا ہے۔ اور یقیناً وہ وقت آنے والا ہے کہ یہ مذہب بالکل نابود ہو جائے گا اور خدائے واحد کی عبادت دنیا میں قائم ہو گی۔

قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّ هُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۴۰﴾

کہا کیا میں اللہ کے سوائے تمہارے لیے معبود چاہوں اور اس نے تم کو مخلوقات پر فضیلت دی ہے۔[1148]

وَ اِذْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ۚ يُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ يَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَ فِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿۱۴۱﴾ ع 16 12 6

اور جب ہم نے تم کو فرعون کے لوگوں سے بچایا وہ تمہیں برا دکھ پہنچاتے تھے تمہارے بیٹوں کو قتل کرتے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھتے اور اس میں تمہارے رب سے بڑی آزمائش تھی۔

وَ وٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّ اَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۚ وَ قَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَ اَصْلِحْ وَ لَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۴۲﴾

اور ہم نے موسیٰ سے تیس رات کا وعدہ ٹھہرایا اور اُن کو دس (اور) سے پورا کیا تب اس کے رب کی مدت چالیس رات پوری ہوئی۔[1149] اور موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا میری قوم میں میری جگہ کام کر اور اصلاح کرنا اور فساد کرنے والوں کی راہ کی پیروی نہ کرنا۔[1150]

1148 - اس میں شرک کے خلاف اعلیٰ درجہ کی دلیل دی ہے جو فطرت انسانی کو اپیل کرتی ہے یعنی فرمایا کہ خدا نے انسان کو تو ساری مخلوقات پر فضیلت دی ہے۔ پھر کیا اسی مخلوقات میں سے تمہارے لیے معبود تجویز کیا جائے اور فطرت انسانی کو اس چیز کے آگے جھکایا جائے جس پر اس کو فضیلت حاصل ہے۔

1149 - سورہ [البقرة: 51:2] میں صاف فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام سے ہم نے چالیس رات کا وعدہ کیا تھا اور یہاں بھی چالیس رات کو ہی ﴿مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ﴾ یعنی رب کا مقرر کردہ وقت کہا ہے۔ اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں کہ پہلے تیس رات کا وعدہ کیا تھا اور اس کے گزر جانے کے بعد پھر دس راتیں اور بڑھا دیں۔ بلکہ مطلب صرف ایک ماہ اور دس دن کو ظاہر کرنے کا۔ کیونکہ تیس رات کا ایک پورا مہینہ بنتا ہے اور اس تقسیم میں اشارہ اس طرف معلوم ہوتا ہے کہ سنت انبیاء پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے بھی چالیس راتیں مقرر کی ہیں، تیس راتیں رمضان کی اور دس ذی الحج کی جو خاص طور پر عبادت کی راتیں ہیں۔

1150 - اخْلُفْنِيْ ۔ [خَلَفَ فُلَانٌ فُلَانًا] سے مراد ہوتی ہے اس کی طرف سے حکومت کے کام کو سنبھالا۔ [قَامَ بِالْاَمْرِ عَنْهُ] (غ)

وَ لَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَ كَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْۤ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ؕ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَ لٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّ خَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّاۤ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۴۳﴾

اور جب موسیٰ ہمارے وقت مقررہ پر آیا اور اس کے رب نے اس سے کلام کیا۔ کہا میرے رب مجھے (اپنا آپ) دکھا کہ میری تیری طرف دیکھوں۔ کہا تو مجھے نہیں دیکھ سکتا لیکن پہاڑ کی طرف دیکھ۔ اگر یہ اپنی جگہ کھڑا رہ گیا تو تُو مجھے بھی دیکھ لے گا۔ پس جب اس کے رب نے پہاڑ پر تجلی فرمائی اس کو ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر گیا۔ پھر جب ہوش میں آیا تو کہا تو پاک ہے میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں اور میں سب سے پہلے ایمان لانے والا ہوں۔ (1151)

ہارونؑ کی خلافت سے مراد:

نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام دونوں تھے۔ مگر حکومت اور سرداری کا منصب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حاصل تھا اس لیے اخْلُفْنِيْ سے مراد صرف یہی ہے کہ حکومت کا کام جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سپرد تھا وہ ان ایام میں حضرت ہارون علیہ السلام کریں۔ نہ یہ کہ ان کی جگہ نبوت کا کام کریں۔ کیونکہ نبی وہ خود اِصالتاً تھے۔ (ر)

1151 - تَجَلّٰى۔ جَلْوٌ کے معنی ہیں کھلے طور پر ظاہر یا الگ کر دینا اسی سے جلاء ہے۔ یعنی وطن سے نکال دینا ﴿وَ لَوْ لَاۤ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَآءَ﴾ [الحشر: 3:59] ''اور اگر اللہ نے ان پر جلاوطنی نہ لکھ دی ہوتی۔'' اور اسی سے جَلْوَةٌ ہے اور تَجَلّٰى کبھی بالذات ہوتی ہے جیسے ﴿وَ النَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى ۙ﴾ [اللیل: 2:92] ''اور دن جب وہ روشن ہوتا ہے۔'' اور کبھی امر اور فعل سے جیسے یہاں۔ (غ)

صَعِقًا۔ [صَعِقَ الْاِنْسَانُ] کے معنی ہیں اس کو غش آ گیا اور ایسے شخص کو صَعِق کہا جاتا ہے۔ (ل)

موسیٰ کا اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کا سوال:

جیسا کہ [نمبر: 78] میں دکھایا جا چکا ہے۔ اصل سوال حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں کا تھا ﴿لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً﴾ [البقرة: 55:2] ''ہم تیری بات کبھی نہ مانیں گے جب تک کہ کھلا کھلا اللہ کو (نہ) دیکھ لیں۔'' انہی کی خاطر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ سوال کیا تھا۔ جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حواریوں کی درخواست کو اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کیا ﴿اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ﴾ [المآئدة: 114:5] ''ہم پر آسمان سے کھانا نازل کر۔'' حالانکہ اس سوال کو ناپسند بھی کرتے تھے اور اپنے متعلق

قَالَ يٰمُوْسٰۤى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَ بِكَلَامِىْ ۖ فَخُذْ مَاۤ اٰتَيْتُكَ وَ كُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾

کہا اے موسیٰ! میں نے تجھے اپنے پیغاموں اور اپنے کلام سے (دوسرے) لوگوں پر چن لیا۔ سو جو میں نے تجھے دیا ہے وہ لے اور شکر کرنے والوں میں سے ہو۔ (1152)

وَ كَتَبْنَا لَهٗ فِى الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَىْءٍ مَّوْعِظَةً وَّ تَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَىْءٍ ۚ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّ اْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا ؕ

اور ہم نے اس کے لیے تختیوں میں ہر قسم کی نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل فرض کر دی۔ سو اس کو مضبوطی سے پکڑ اور اپنی قوم کو حکم دے کہ اس کی بہترین باتیں پکڑے

درخواست اس لیے کی کہ بنی اسرائیل کے وہ سردار تو خدا سے بہت دور پڑے ہوئے تھے۔ اس لیے اگر انسان کے لیے ان آنکھوں سے خدا کو دیکھنا ممکن ہے تو خدا کا ایک نبی اسے دیکھ سکتا ہے جس کے ساتھ وہ کلام بھی کرتا ہے۔ جواب ملا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ بلکہ وہ اپنی تجلیات سے دیکھا جاتا ہے اور اس کی تجلیات کیا ہیں؟ قدرت کے سب کام اس کی تجلیات میں ہیں۔ ہاں بعض تجلیات دوسروں سے بڑھ کر ہوتی ہیں۔ سو اللہ تعالیٰ نے اس وقت اپنی تجلی کا ایک زبردست نمونہ دکھایا جس سے پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ یہی وہ رنگ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کا طاقتور ہاتھ دنیا میں کام کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ بڑے بڑے انسان اور بڑی بڑی قومیں جو پہاڑوں سے زیادہ مضبوط ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے طاقتور ہاتھ کے سامنے یوں پاش پاش ہو جاتے ہیں کہ گویا کچھ بھی نہ تھے۔ اور شاید اس تجلی کے دکھانے میں بھی یہ اشارہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت کے سامنے مشکلات کے پہاڑ بھی ہوں گے تو اڑ جائیں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے اللہ تعالیٰ کی اس تجلی میں ایک اور اشارہ بھی معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کی کامل تجلی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے مقدر نہ تھے۔ بلکہ اس کا ظہور محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مقدر تھا۔ اسی لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس ریزہ ریزہ شدہ پہاڑ کے مقابل پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تجلی کے مقام کو بلد امین کے نام سے موسوم کیا ہے ﴿وَ طُوْرِ سِيْنِيْنَ ۙ۝ وَ هٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۙ۝﴾ [التین: 95:2-3] ''اور سینا پہاڑ۔ اور یہ امن والا شہر۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ان آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کو نہ دیکھ سکنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ قیامت کے دن بھی مومن اللہ تعالیٰ کو نہ دیکھ سکیں گے کیونکہ وہ اور حواس ہوں گے۔

1152 - **کلام الٰہی اور رسالت:** یہاں رسالت اور کلام کو الگ الگ کیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کلام ان سے بھی کرتا ہے جن کے سپرد رسالت کا کوئی کام نہیں ہوتا۔ جیسے اس امت کے مجددین۔ رسالت پیغام ہے جو عموماً حکم کے رنگ کا ہوتا ہے اور کلام میں پیشگوئیاں وغیرہ داخل ہیں۔

سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۱۴۵﴾ میں تم کو نافرمانوں کا گھر (بھی) دکھادوں گا۔(1153)

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ وَ اِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَ اِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ

میں اپنی آیات سے ان لوگوں کو پھیر دوں گا جو زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں اور اگر وہ ہر ایک نشان بھی دیکھ لیں تو اس پر ایمان نہ لائیں۔ اور اگر وہ درستی کی راہ دیکھ لیں تو

1153- كَتَبْنَا۔ كِتَاب بمعنی اثبات، ایجاب، فرض بھی آتا ہے۔ (غ) پس مراد یہاں فرض کر دینا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ جس کو انسان کی آنکھ دیکھ نہیں سکتی۔ اس کی تحریر انسان کی تحریر کی طرح نہیں ہوسکتی۔ اس کا لکھنا اس کا فرض کر دینا ہے جیسے ﴿ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِيْ ﴾ [المجادلة:21:58] ''اللہ نے لکھ دیا ہے کہ یقیناً میں غالب رہوں گا اور میرے رسول۔'' میں بھی یہی مراد ہے۔ ایسا ہی ﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ ﴾ [البقرة: 180:2] ''تم پر جب تم میں سے کسی کے لیے موت آموجود ہو۔'' میں یا ﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ ﴾ [البقرة: 183:2] ''تمہارے لیے روزے ضروری ٹھہرائے گئے ہیں۔'' میں۔

اللہ تعالیٰ کے توریت لکھنے سے مراد:

ان تمام موقعوں پر فعل کتاب اللہ کی طرف منسوب ہے اس لیے اگر توریت کو الواح میں خدا نے خود لکھا تھا تو قرآن میں بھی یہ احکام خود ہی لکھے۔ یہ کہنا کہ توریت اپنے ہاتھ سے لکھی اور قرآن اپنے ہاتھ سے نہیں لکھا ایک بے معنی تفریق ہے۔ اس بارہ میں کوئی صحیح حدیث نہیں ہے اگر کتابوں میں کوئی کتاب خصوصیت سے ممتاز ہے تو وہ قرآن کریم ہے۔ اس کے مقابل میں توریت کے علوم سمندر کے مقابل میں ایک چھوٹی سی ندی کا حکم بھی نہیں رکھتے۔

توریت میں ہر چیز کی تفصیل سے مراد:

﴿ لِكُلِّ شَيْءٍ ﴾ یعنی ہر چیز جن کی ان کو اس وقت حاجت تھی۔ کیونکہ باوجود اس تفصیل کے بعد میں جو انبیاء علیہم السلام آئے ان کو کتابیں بھی دیں گئیں جیسے داؤد علیہ السلام کو زبور اور عیسیٰ علیہ السلام کو انجیل اور ان کتابوں میں ان باتوں کی تفصیل تھی جن کی ضرورت ان انبیاء علیہم السلام کے وقت میں پیش آئی۔

بِاَحْسَنِهَا۔ تعلیم جو خدا کی طرف سے آتی ہے سب ہی احسن ہوتی ہے مگر چونکہ یہاں ایک بلند مقام کی طرف اشارہ ہے اس لیے خصوصیت سے احسن وجہ پر قائم رہنے کا حکم دیا ہے۔ اگر نبی کے پہلے متبعین ہی اعلیٰ مقامات پر نہ پہنچیں تو پچھلے بہت ہی گر جائیں گے۔ اسی کی طرف ﴿ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ ﴾ میں اشارہ کیا ہے۔ یعنی اس قوم کی حالت ایک وقت نافرمانی کی ہو جانے والی ہے اور فاسقوں کا جو انجام ہوتا ہے وہ بھی تم دیکھو لو گے۔ ﴿ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ ﴾ سے یہی مراد ہے۔ یا یہ کہ تم کو دکھادوں گا کہ فاسقوں کا انجام کیا ہوتا ہے۔

الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۚ وَ اِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ كَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۴۶﴾

اسے (اپنا) رستہ نہ ٹھہرائیں اور اگر وہ گمراہی کا رستہ دیکھ تو اسے (اپنا) رستہ بنالیں۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور ان سے غافل رہے۔[1154]

وَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ لِقَآءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ؕ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۷﴾ ع 17 6 7

اور جنہوں نے ہماری آیات کو اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا ان کے عمل بے کار ہوئے ان کو کوئی بدلہ نہ ملے گا۔ مگر وہی جو عمل کرتے تھے۔

وَ اتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ؕ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَ لَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا ۘ اِتَّخَذُوْهُ وَ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۸﴾ وقف لازم

اور موسیٰ کی قوم نے اس کے پیچھے اپنے زیوروں سے ایک بچھڑا بنالیا ایک جسم جس میں سے گائے کی آواز نکلتی تھی۔ کیا انہوں نے نہ دیکھا کہ وہ ان سے کلام نہیں کرتا اور نہ ان کو رستہ دکھاتا ہے۔ اس کو (معبود) بنالیا اور وہ ظالم تھے۔[1155]

1154 - ہوسکتا ہے کہ اس کلام کا خطاب کفار مکہ سے ہو اور ہوسکتا ہے اور بنی اسرائیل سے ہی یہ خطاب منقول ہو۔ متکبر اپنے کبر کی وجہ سے حق اور صداقت سے دور جا پڑتا ہے یہاں تک کہ غلطی اسے اچھی معلوم ہوتی ہے اور دلائل اور نشانات کی وہ کچھ پروا نہیں کرتا۔ تکبر تمام بدیوں کی جڑ ہے۔

1155 - حُلِيّ۔ حَلًى کی جمع ہے۔ زیورات۔ اسی سے ہے ﴿يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ﴾ [الکهف: 31:18] ''انہیں سونے کے کڑے پہنائے جائیں گے۔'' ﴿وَّ حُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ﴾ [الدهر: 21:76] ''اور وہ چاندی کے کنگن پہنے ہوئے ہوں گے۔'' حِلْيَةٍ کے معنی بھی زیور ہیں اور ﴿اَوَ مَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ﴾ [الزخرف: 18:43] ''کیا وہ جو زیور میں پرورش پائے۔'' جنگل میں مال اور دولت تو کیا ہوگا، زیورات جو کچھ پاس تھے ان کو اکٹھا کر کے یا ان میں سے بطور چندہ لے کر ایک بچھڑے کی صورت بنالی۔

جَسَدًا - عِجْلًا سے بدل ہے یا اس کی صفت یعنی وہ محض ایک جسم تھا جس کے اندر کوئی جان نہ تھی۔

خُوَارٌ - گائے کی آواز کو کہتے ہیں۔

وَ لَمَّا سُقِطَ فِيْۤ اَيْدِيْهِمْ وَ رَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا ۙ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَ يَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾

اور جب وہ پشیمان ہوئے اور دیکھ لیا کہ وہ یقیناً گمراہ ہو گئے کہنے لگے اگر ہمارے رب نے ہم پر رحم نہ کیا اور ہمیں نہ بخشا تو یقیناً ہم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔(1156)

وَ لَمَّا رَجَعَ مُوْسٰۤى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۙ قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ مِنْۢ بَعْدِيْ ۚ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ ۚ وَ اَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَ اَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗۤ اِلَيْهِ ؕ قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِيْ وَ كَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ ۪ فَلَا

اور جب موسیٰ اپنی قوم کی طرف لوٹ کر آیا غضبناک افسوس کرتا ہوا۔ کہا میرے پیچھے تم نے میری بری نیابت کی۔(1157) کیا تم نے اپنے رب کے امر کو جلد چاہا؟(1158) اور تختیاں ڈال دیں اور اپنے بھائی کا سر پکڑ کر اس کو اپنی طرف کھینچا۔ اس نے کہا ماں کے بیٹے! قوم نے مجھے کمزور سمجھا اور قریب تھا کہ مجھے مار دیں

اللہ تعالیٰ کا کلام کرنا منقطع نہیں ہو سکتا:

بچھڑے کے معبود بنانے کے خلاف جو دلیل یہاں دی ہے وہ یہ ہے کہ وہ ان سے بات نہیں کرتا تھا اور نہ رستہ بتاتا تھا۔ پس معلوم ہوا معبود وہ ہو سکتا ہے جو کلام بھی کرے اور رستہ بھی دکھائے۔ جو لوگ اس زمانہ میں خدا کا کلام کرنا بالکل منقطع مانتے ہیں وہ اس کی معبودیت کے خلاف اسی دلیل سے اپنے آپ کو ملزم ٹھہراتے ہیں۔

1156 - ﴿سُقِطَ فِيْۤ اَيْدِيْهِمْ﴾ سقوط ایک چیز کا بلند مکان سے پست مکان میں گرنا ہے اور ﴿سُقِطَ فِيْۤ اَيْدِيْهِمْ﴾ بطور محاورہ کے نادم ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

1157 - اَسِفًا۔ اَسَفٌ وہ غم ہے جس کے ساتھ غضب بھی ملا ہوا ہو۔ اور صرف بمعنی غم و بمعنی غضب بھی آتا ہے۔ (غ) حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بذریعہ وحی قوم کی اس لغزش کا علم ہو گیا تھا ﴿قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَ اَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ۝﴾ [طٰہٰ: 85:20] ''کہا تو ہم نے تیری قوم کو تیرے پیچھے فتنہ میں ڈالا، اور سامری نے انہیں گمراہ کیا۔'' اس لیے آپ قوم کے اس مشرکانہ فعل پر غصہ میں تھے۔ ایسے امور میں غضب کا آنا مذموم نہیں بلکہ مستحسن ہے۔

1158 - ﴿اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ﴾ کے معنی کئی طرح پر کیے گئے ہیں۔ [عَجِلْتُمْ عَمَّا أَمَرَكُمْ بِهِ رَبُّكُمْ] یعنی ''تمہارے رب نے جو وعدہ تم سے کیا تھا اس کے بارے میں جلدی کی۔'' کشاف میں [عَجِلْتُمْ عَنْ أَمْرِ رَبِّكُمْ] مراد لے کر

فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْاَعْدَآءَ وَ لَا تَجْعَلْنِيْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۵۰﴾

سو دشمنوں کو مجھ پر مت ہنسا۔ اور مجھے ظالم لوگوں کے ساتھ نہ ملا۔ (1159)

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَ لِاَخِيْ وَ اَدْخِلْنَا فِيْ رَحْمَتِكَ ۖ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۵۱﴾ ع 18 4 8

(موسیٰ نے) کہا میرے رب! میری اور میرے بھائی کی حفاظت فرما اور ہم کو اپنی رحمت میں داخل کر اور تو سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ ذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ ﴿۱۵۲﴾

جن لوگوں نے بچھڑا بنایا ان کو ان کے رب کی طرف سے ناراضگی اور دنیا کی زندگی میں رسوائی پہنچ کر رہے گی اور اسی طرح ہم جھوٹ بنانے والوں کو سزا دیتے ہیں۔ (1160)

[عَجَّلَ عَنِ الْأَمْرِ] کے معنی کیے ہیں [تَرَكَهُ غَيْرَ تَامٍّ] یعنی ''اسے نامکمل چھوڑا'' لیکن سورۃ طٰہٰ میں اس کی تفسیر خود موجود ہے جہاں [آیت نمبر: 86] میں ایسا ہی ذکر کر کے فرمایا ﴿اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ یعنی ''کیا (چالیس رات کا) عہد تمہیں لمبا معلوم ہوا۔ یا تم نے چاہا کہ تم پر تمہارے رب کا غضب نازل ہو۔'' پس اَمْرَ رَبِّكُمْ سے مراد رب کی سزا یا اس کا غضب ہی ہے اور امر بمعنی سزا قرآن کریم میں آیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ سزا تو قوم پر پیچھے دیر سے آیا کرتی ہے مگر تم نے اس کو میری زندگی میں اور میرے سامنے اس قدر جلدی لانا چاہا۔

1159 - تُشْمِتْ۔ شَمَتَ سے ہے اور شَمَاتَةٌ اس خوشی کو کہا جاتا ہے جو دشمن کے مبتلائے مصیبت ہونے پر ہو اور تَشْمِيْتَ چھینکنے والے کو جو دعا دی جائے اسے کہتے ہیں۔ گویا اس طرح سے شَمَاتَتْ کا ازالہ کیا جاتا ہے۔ (غ)

ان الفاظ سے قرآن کریم نے حضرت ہارون علیہ السلام کے بچھڑا بنانے میں شرکت سے صاف انکار کیا ہے اور یوں بائبل کے اس بیان کو غلط ٹھہرایا ہے کہ ہارون نے ہی یہ بچھڑا بنایا تھا۔ حضرت ہارون علیہ السلام جیسا کہ یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف اس لیے خاموش رہے کہ انہیں خوف تھا کہ اگر انہوں نے حکما روکا تو لوگ انہیں قتل کر دیں گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سر کو پکڑ کر ان کو کھینچنا اس غصہ کی وجہ سے تھا جو ان کو صحیح طور پر تھا۔ اور انہیں یہ بھی خیال ہوگا کہ ہارون علیہ السلام نے کیوں ان کو حکما اس سے نہیں روک دیا۔ آخر جب وجہ سنی تو بھائی کو اپنے ساتھ دعا میں شامل کیا۔ حضرت ہارون علیہ السلام کا ابن ام سے خطاب کرنا رحمت کی طرف توجہ دلانے کو ہے۔

1160 - ان الفاظ سے معلوم ہوا کہ [البقرۃ: 54:2] میں جو ﴿فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ کا حکم ہے اس سے مراد فی الواقع قتل نہیں کیونکہ یہاں سزا صرف اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور دنیا میں رسوائی بتائی ہے اور اگلی آیت میں اس سزا کے ٹل جانے کی صورت توبہ بتائی ہے۔

وَ الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا وَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۵۳﴾

اور جنہوں نے برے کام کیے پھر اس کے بعد توبہ کی اور ایمان لائے یقیناً تیرا رب اس کے بعد بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

وَ لَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوْسَى الْغَضَبُ اَخَذَ الْاَلْوَاحَ ۖۚ وَ فِيْ نُسْخَتِهَا هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ ﴿۱۵۴﴾

اور جب موسیٰ کا غصہ تھم ہوا تختیاں لیں۔ اور ان کی تحریر میں ان لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت تھی جو اپنے رب سے خوف رکھتے ہیں۔ (1161)

وَ اخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّاۤ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ

اور موسیٰ نے اپنی قوم کے ستر آدمی ہمارے وعدہ کے لیے چن لیے۔ (1162) پھر ان کو زلزلے نے آلیا،

1161 - [خروج: 19:32] میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے غصہ میں تختیاں توڑ ڈالیں مگر قرآن اس کا مؤید نہیں اور نہ یہ نبی کی شان کے شایاں ہے۔ قوم پر ناراض ہو کر احکام خدا کا استخفاف نبی کا کام نہیں ہوسکتا۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم توریت سے نقل نہیں کرتا بلکہ اصل سرچشمہ کوئی اور ہے۔ اسی لیے موقعہ موقعہ پر بائبل کی غلطیوں کی اصلاح کرتا چلا جاتا ہے۔ اسی ایک واقعہ میں تین اہم امور میں بائبل کے قصہ کی اصلاح فرمائی ہے۔

① اول حضرت ہارون علیہ السلام کی شرک عجل میں علیحدگی، حالانکہ بروئے بائبل ہارون ہی بچھڑا بنانے والے تھے۔

② دوم یہی تختیوں کا توڑنا۔

③ سوم بچھڑے کو جلا کر اس کی خاکستر کو پانی میں ملا کر بنی اسرائیل کو پلانا جو ایک بے معنی بات ہے دیکھو [طٰہٰ: 98]۔

1162 - ذکر عجل کے بعد کلام کا رجوع پھر اسی اصل واقعہ کی طرف کیا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے طور پر جانے کا واقعہ ہے۔ یہ یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ قرآن کریم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صرف ایک ہی میقات کا ذکر کیا ہے۔ توریت میں دو دفعہ طور پر جانے کا ذکر ہے جس کی وجہ توریت کی تختیوں کا ٹوٹ جانا ہے۔ یعنی چونکہ پہلی دفعہ جو تختیاں حضرت موسیٰ علیہ السلام لائے تھے وہ غصہ میں آ کر توڑ دیں۔ اس لیے دوبارہ پھر تختیاں وہیں سے لینے گئے۔ مگر چونکہ قرآن کریم اس تختیوں کے توڑنے کے واقعہ کو ہی تسلیم نہیں کرتا اس لیے دوسری میقات کا اس میں نہ کوئی ذکر ہے اور نہ ہوسکتا ہے اور مفسرین کا یہ خیال کہ بچھڑے کی پرستش کی وجہ سے جو ناراضگی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوئی۔ اس کے لیے پھر جانے کی ضرورت پیش آئی یا حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ہارون علیہ السلام کے قتل کا الزام جب بنی اسرائیل نے لگایا تو اس کی صفائی کے لیے ہارون علیہ السلام کی قبر پر ان ستر آدمیوں کو لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام

قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَ اِيَّايَ ؕ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ؕ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَ تَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ ؕ اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَ ارْحَمْنَا وَ اَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾

کہا میرے رب اگر تو چاہتا ان کو اور مجھے پہلے سے ہلاک کر دیا ہوتا کیا تو ہم کو اس لیے ہلاک کرتا ہے جو ہم میں سے بیوقوفوں نے کیا۔ یہ صرف تیری آزمائش ہے۔ تو اس کے ساتھ جسے چاہتا ہے گمراہ ٹھہراتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے تو ہی ہمارا ولی ہے سو ہماری حفاظت فرما اور ہم پر رحم کر اور تو سب سے بہتر حفاظت کرنے والا ہے۔ (1163)

وَ اكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَاۤ اِلَيْكَ ؕ قَالَ عَذَابِيْۤ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَ

اور ہمارے لیے اس دنیا میں بھلائی لکھ دے اور آخرت میں ہم تیری طرف رجوع کرتے ہیں۔ کہا میرا عذاب اس میں جسے چاہوں مبتلا کروں اور میری رحمت

گئے محض قصے ہیں۔ پس یہ ستر آدمی وہی تھے جو اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ گئے۔ جب آپ کو شریعت دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے طور پر بلایا تھا۔ اور انہوں نے ہی کہا تھا ﴿لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً﴾ [البقرة: 55:2] ''ہم تیری بات نہیں مانیں گے جب تک کہ اللہ کو کھلا کھلا (نہ) دیکھ لیں۔'' اور اس کے مطابق ابن جریر میں ایک روایت بھی موجود ہے اور ذکر عجل کے بعد پھر طور والے واقعہ کا ذکر اس لیے کیا کہ اس پیشگوئی کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے جو توریت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بتائی گئی۔ جیسا کہ [آیت نمبر: 157] میں صاف اس کی تصریح فرما دی۔

1163- اَلرَّجْفَةُ کے لیے [دیکھو نمبر: 1113]۔ سورۂ بقرہ کی [آیت: 55] میں اسی کو الصّٰعِقَةُ کہا ہے جس کو یہاں اَلرَّجْفَةُ کہا ہے اور دونوں جگہ ایک ہی واقعہ کا ذکر ہے [فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ، وَهِيَ الصَّاعِقَةُ] (ج) اب گو اَلصَّاعِقَة کئی معنوں میں آتا ہے مگر اَلرَّجْفَةُ صرف زلزلہ کے معنی میں آتا ہے اور چونکہ صَاعِقَة کے معنی صوت شدید یعنی سخت آواز ہیں اس لیے اس سے مراد وہ آواز ہے جو بڑے زلزلہ سے پہلے آتی ہے۔

یہاں بعض مفسرین نے صرف غشی کا واقع ہونا مراد لیا ہے [قِيْلَ: غَشِيَ عَلَيْهِمْ ثُمَّ أَفَاقُوْا] (ر) یعنی ان کو صرف غشی آئی تھی پھر افاقہ ہو گیا [اَوْ اَصْعَقَهُمْ فَسُلِبَ أَفْهَامُهُمْ] (ج) یعنی ان پر صاعقہ بھیجا اور ان کے فہموں کو سلب کر لیا اور یہی حق ہے جیسا کہ [نمبر: 79] میں دکھایا جا چکا ہے اور جو بیوقوفوں نے کیا اس سے مراد ان کا یہ کہنا ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ کو کھلا کھلا نہ دیکھ لیں ہم ایمان نہ لائیں گے۔

رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَ یُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ الَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۵۶﴾

ہر شے پر حاوی ہے۔ سو میں اس کو ان کے لیے لکھ دوں گا جو تقویٰ کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں۔ (1164)

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِیْلِ ۫ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ یَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ یُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَ یُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓىِٕثَ وَ یَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ ؕ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ ۙ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ ع 19 6 9

اور وہ جو رسول نبی امی کی پیروی کرتے ہیں جسے وہ اپنے پاس توریت اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں وہ ان کو بھلی باتوں کا حکم دیتا اور ان کو بری باتوں سے روکتا اور ان کے لیے ستھری چیزیں حلال کرتا اور ان پر ناپاک چیزیں حرام کرتا اور ان سے ان کا بوجھ اتارتا ہے اور وہ طوق بھی جو اُن پر تھے۔ سو جو لوگ اس پر ایمان لائیں اور اس کی تعظیم کریں اور اس کو مدد دیں اور اس نور کی پیروی کریں جو اس کے ساتھ اتارا گیا ہے وہی کامیاب ہوں گے۔ (1165)

1164 - ﴿رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ﴾ اس قدر وسیع رحمت الٰہی کا علم محمد رسول اللہ ﷺ کو ہی اللہ تعالیٰ نے دیا۔ جو دنیا کی تمام اشیاء پر حاوی ہے جس میں مسلم اور کافر، فرمانبردار اور عاصی دونوں آ جاتے ہیں۔ وہ رحمان ہے اور اس کی رحمت بلا عمل کام کرتی ہے۔ اس لیے کفار کو بھی اس سے فائدہ پہنچتا ہے۔ مگر مومنوں کے لیے خصوصیت سے اس کا اثبات کیا ہے۔

1165 - اَلْاُمِّیَّ۔ اُمِّیٌّ ناخواندہ کو بھی کہتے ہیں اور اس شخص کو بھی جو ام القریٰ یعنی مکہ کی طرف منسوب ہو [دیکھو نمبر: 102]۔ اور نبی امی سے مراد نبی عربی ہی ہے جیسا کہ آگے دکھایا جائے گا۔

اِصْرَهُمْ۔ اِصْرٌ کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 365]۔ یہاں مراد ایسا عہد ہے جس کا نقض خیرات سے محروم کر دیتا ہے۔ جیسے وہ عہد جو انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ لیا جاتا ہے اور عام طور پر کسی امر کو کہا جا سکتا ہے جو خیرات سے روک دے۔ (غ)

اَغْلٰلَ۔ غُلٌّ کی جمع ہے [دیکھو نمبر: 850]۔ وہ لوہا جس کے ذریعہ سے ہاتھ گردن سے باندھ دیئے جاتے ہیں۔ اس سے مراد بھی ایسی چیز ہے جو انسان کو کام سے روک دے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا ِۨالَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ

کہہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔ وہ جس کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے۔ اس کے سوائے کوئی معبود نہیں وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے سو اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول نبی امی پر جو اللہ اور

عَزَّرُوْهُ۔ تَعْزِيْرٌ۔ اس نصرت کو کہتے ہیں جس کے ساتھ تعظیم ملی ہوئی ہو اور اسی سے تعزیر سزا کے معنی میں ہے، کیونکہ وہ بھی ایک نصرت ہے جو ظلم سے روکتی ہے۔ (غ)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو توریت ملنے کے ذکر میں اس پیشگوئی کا ذکر کر دیا ہے اور ضروری تھا کہ کیا جاتا جو توریت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے متعلق ہے بلکہ اسی غرض کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر بھی کیا تھا۔ اس پیشگوئی میں رسول نبی امی کا ذکر کیا ہے۔ امی کے معنی اگر ناخواندہ لیے جائیں تو پیشگوئی میں کسی ناخواندہ رسول کے آنے کا کوئی ذکر نہیں لیکن اس کے معنی اگر منسوب بہ ام القریٰ یعنی مکی یا عربی لیے جائیں تو پیشگوئی میں رسول عربی کا ذکر ہے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس پیشگوئی میں جو [استثناء: 18:15-18] میں ہے بنی اسرائیل کو خطاب کر کے یہ صاف ذکر ہے کہ تیرے بھائیوں میں سے ایک نبی اٹھاؤں گا اور ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل کی بھائی قوم بنی اسماعیل ہی تھی۔ گویا یوں بتا دیا کہ وہ رسول عربی ہوگا۔ اور پھر فاران سے اس کے طلوع کا ذکر بھی موسیٰ علیہ السلام کی کتاب میں موجود ہے۔

انجیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی:

دوسری بات اس رسول کے متعلق بتائی کہ اس کا ذکر توریت میں ہی نہیں بلکہ انجیل میں بھی ہے۔ انجیل میں یہ ذکر دو طرح پر موجود ہے۔ ایک اس طرح پر کہ اسی مثل موسیٰ علیہ السلام رسول کا ذکر انجیل میں ہے دیکھو [یوحنا: 21:1] کہ وہ اس وقت تک نہ آیا تھا اور دوسرے اس طرح پر کہ انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیشگوئی دوسرے فارقلیط کے آنے کی ہے۔ دیکھو [یوحنا باب: 14-16]۔ یہ کھلی کھلی پیشگوئیاں ہیں جو اور کسی کے حق میں پوری نہیں ہوئیں۔

رسول موعود کی صفات:

اس کے بعد اس رسول کی صفات بیان کی ہیں۔ اصر اور اغلال کے دور کرنے سے مراد یہ ہے کہ ان تمام باتوں کو دور کرتا ہے جن سے انسان نیکیوں کے کرنے میں رکتا ہے۔ گویا بدیوں کی جڑ کاٹتا ہے اور انسان کی ترقی کی حقیقی راہ کھولتا ہے۔ اہل کتاب کے لیے یہ ایک کھلا نشان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا تھا کہ کس طرح وہ لوگ جن کی اصلاح سے یہودی اور عیسائی دونوں عاجز آ چکے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت قدسی سے ہر قسم کی بدیوں سے پاک ہوتے چلے جاتے تھے۔ کس طرح صدیوں کی بدیوں اور رسم ورواج کی قیدوں سے وہ آزاد ہوتے چلے جاتے تھے۔ اس طرح پر نیکی کا دنیا میں پھیلانا سوائے صادق کے دوسرے کا

يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ كَلِمٰتِهٖ وَ اتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

اس کے کلموں پر ایمان لاتا ہے اور اس کی پیروی کرو تا کہ تم ہدایت پاؤ۔ (1166)

وَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰۤى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَ بِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۵۹﴾

اور موسیٰ کی قوم میں سے ایک جماعت ہے جو حق کے ساتھ ہدایت کرتے اور اس کے ساتھ عدل کرتے ہیں۔ (1167)

وَ قَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَیْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا ؕ وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰۤى اِذِ اسْتَسْقٰىهُ قَوْمُهٗۤ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۚ فَانْۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ وَ ظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ

اور ہم نے ان کو بارہ قبیلوں میں (الگ الگ) قومیں بنا کر تقسیم کر دیا اور ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی جب اس کی قوم نے اس سے پانی مانگا کہ اپنے عصا کو چٹان پر مار۔ تو اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔ ہر ایک قوم نے اپنا گھاٹ جان لیا اور ہم نے ان پر بادلوں کا سایہ کیا اور ہم نے ان پر من اور سلویٰ اتارا۔ ستھری چیزوں سے جو ہم نے تم کو دی

کام نہ ہو سکتا تھا۔ اس لیے جب پیشگوئی کا ذکر کیا تو یہ بھی بتایا کہ جن بیڑیوں کو تم نہیں کاٹ سکے ان کو عرب کے ایک امی نے کاٹ دیا اور یہی اس کے منجانب اللہ ہونے کا کافی نشان ہے۔

1166 - **ساری نسل انسانی کا نبی:** یہ اس نبی عربی کی خصوصیت بتائی اور بتایا کہ اس کے لیے ان پیشگوئیوں کا توریت و انجیل میں ذکر بے معنی نہ تھا بلکہ اس قدر اہمیت اس کے ذکر کو اس لیے دی گئی کہ اس نے دنیا کی سب قوموں کی طرف رسول ہو کر آنا تھا۔ آپ سے پہلے تمام رسول ایک ایک قوم کی طرف آئے جیسا کہ خود ان انبیاء علیہم السلام کے ذکر سے جو اس سورت میں ہو چکا ظاہر ہے۔ کیونکہ اس وقت کے حالات اسی کے مقتضی تھے۔ لیکن اس کا نتیجہ قومی تفریق اور بُعد ہوا اور اس لیے سب سے آخر اللہ تعالیٰ نے ایک ایسا رسول بھیجا جو ساری قوموں کو اپنے جھنڈے تلے جمع کرے اور ساری نوع انسانی میں وحدت پیدا کرے۔ دنیا کے جس قدر مذاہب اسلام سے پہلے ہوئے وہ سب قومی مذاہب تھے اور جس قدر نبی ہوئے وہ سب قومی نبی تھے۔ مگر کل نسل انسانی کا مذہب اور کل بنی نوع انسان کا نبی ایک ہی ہوا، وہی جس کے منہ میں یہ لفظ ڈالے گئے ﴿اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا﴾۔

1167 - یہ بتانا مقصود ہے کہ ساری قوم نافرمان نہ تھی۔ ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو حق کے ساتھ دوسروں کو ہدایت بھی کرتے۔ اس لیے خود بھی حق پر قائم ہوتے اور معاملات میں بھی حق کے ساتھ عدل کا معاملہ کرتے۔

وَ مَا ظَلَمُوْنَا وَ لٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ
يَظْلِمُوْنَ ﴿١٦٠﴾

ہیں کھاؤ اور انہوں نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا بلکہ اپنی ہی جانوں پر ظلم کرتے تھے۔

وَ اِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَ
كُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَ قُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّ
ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ
خَطِيْٓـٰٔتِكُمْ ؕ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١٦١﴾

اور جب ان کو کہا گیا اس بستی میں رہ پڑو اور جہاں سے چاہو اس سے کھاؤ اور کہو ہمارے گناہ معاف کیے جائیں اور دروازے میں فرمانبرداری کرتے ہوئے داخل ہو۔ ہم تمہاری خطائیں بخش دیں گے۔ احسان کرنے والوں کو ہم بڑھ کر دیں گے۔

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ
الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا
مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿١٦٢﴾ ع 20 5 10

مگر اُن لوگوں نے جو ان میں سے ظالم تھے اس بات کے سوائے جو ان کو کہی گئی تھی دوسری بات بدل دی۔ سو ہم نے اُن پر آسمان سے وبا بھیجی اس لیے کہ وہ ظلم کرتے تھے۔(1168)

وَ سْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ
حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ (وقف لازم)
اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ
شُرَّعًا وَّ يَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِيْهِمْ ۛ (معانقة 6)
كَذٰلِكَ ۛ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿١٦٣﴾ (النصف)

اور ان سے اس بستی کا حال پوچھ جو دریا پر واقع تھی۔ جب وہ سبت کے بارے میں حد سے بڑھتے تھے۔ جب ان کے سبت کے دن ان کی مچھلیاں پانی کے اوپر ان کے سامنے آجاتیں اور جس دن ان کا سبت نہ ہوتا ان کے سامنے نہ آتیں۔ اسی طرح ہم ان کو آزماتے رہے اس لیے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔(1169)

1168- ان واقعات کو تیسری دفعہ بیان کیا ہے۔ پہلی دفعہ [سورۂ بقرہ:61] میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذکر میں، دوسری دفعہ [سورۂ نساء: 154] میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذکر میں، تیسری دفعہ یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر میں اور ہر مقام پر لانے میں ایک خاص غرض ہے۔

1169- اَلْقَرْيَةَ اس بستی کو بعض نے ایلہ کہا ہے جو مدین اور طور کے درمیان بحیرہ قلزم پر واقع ہے اور بعض نے خود مدین۔

وَ اِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

اور جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا تم کیوں اس قوم کو وعظ کرتے ہو جسے اللہ ہلاک کرنے والا ہے یا ان کو سخت عذاب دینے والا ہے؟ انہوں نے کہا تاکہ تمہارے رب کے سامنے معذور رہوں اور شاید کہ وہ تقویٰ کریں۔

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖۤ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَ اَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۭ بَـِٕيْسٍۭ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۵﴾

سو جب انہوں نے اسے چھوڑ دیا جس کی ان کو نصیحت کی گئی تھی ہم نے ان کو بچالیا جو بدی سے روکتے تھے اور جو ظالم تھے ان کو سخت عذاب میں پکڑ لیا اس لیے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔

فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ﴿۱۶۶﴾

سو جب انہوں نے اس سے سرکشی کی جس سے روکے گئے تھے ہم نے انہیں کہا ذلیل بندر ہو جاؤ۔[1170]

حِيْتَانٌ۔ حُوْتٌ کی جمع ہے مچھلی۔

شُرَّعًا۔ شَارِعٌ کی جمع۔ شَرَعَ سے ہے جس کے معنی میں اظہار و تبیین ہے۔ اس لیے شُرَّعًا کے معنی ہیں [ظَاهِرَةً عَلٰى وَجْهِ الْمَآءِ] یعنی پانی کے اوپر نظر آنے والیاں۔ سبت کے دن مچھلیوں کا پانی کے اوپر آ جانا اور دوسرے دنوں میں نہ آنا یہودیوں کے لیے موجب ابتلا ہوا۔ اس لیے کہ سبت کے دن ان کو شکار کی ممانعت تھی اور مچھلیوں کے اس دن اوپر آنے کی وجہ بھی یہی تھی کہ اس دن اس کا شکار نہ کیا جاتا تھا اور جانور کی یہ عادت ہے کہ وہ وقت کو پہچانتا ہے۔

اس رکوع میں بھی یہود کی سرکشی کی مثالیں دی ہیں۔ نبی کریم ﷺ کو تسلی دینے کے لیے ان مثالوں کو اس وقت پیش کیا ہے جب ابھی یہود سے آپ کا معاملہ نہیں پڑا۔ تاکہ جب یہ قوم آپ کے ساتھ سرکشی سے پیش آئے تو آپ کو رنج نہ ہو اور یہ علم ہو کہ اس قوم کی عادت ہی سرکشی رہی ہے۔ ان لوگوں نے کس قدر غلطی کھائی ہے جنہوں نے یہ خیال کیا کہ پہلے پہلے نبی کریم ﷺ یہود کو اچھا کہتے تھے اور جب مدینہ میں اس قوم نے آپ کی مخالفت کی تب ان کو برا کہنا شروع کیا۔ حالانکہ یہ سورت بالاتفاق مکی ہے اور اس وقت بھی قرآن کریم یہود کے اسی نقشہ کو پیش کرتا ہے جس کو بعد میں سورہ بقرہ میں مدینہ میں پیش کیا ہے۔

1170 – ان کے قِرَدَةً یا بندر بننے کی تشریح [نمبر: 94] میں گزر چکی ہے۔ یہاں یہ بات مزید قابل غور ہے کہ ایک طرف تو ان کے بندر بنانے کا ذکر کیا اور ساتھ ہی دوسری آیت میں یہ ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تک ان پر ایسے لوگوں کو حاکم بناتا رہے گا

وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ؕ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ ۖۚ وَ اِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۶۷﴾

اور جب تیرے رب نے خبر دے دی کہ ان پر قیامت کے دن تک ایسے لوگوں کو اٹھاتا رہے گا جو ان کو برا عذاب دیتے رہیں۔ بے شک تیرا رب بدی کی سزا جلد دیتا ہے اور یقیناً وہ بخشنے والا رحم کرنے والا بھی ہے۔ (1171)

وَ قَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَ مِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ ۫ وَ بَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَ السَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۶۸﴾

اور ہم نے انہیں فرقے بنا کر ملک میں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا کچھ ان میں سے صالح ہیں اور کچھ اور طرح کے ہیں، اور ہم ان کو سکھوں اور دکھوں سے آزماتے رہے تاکہ وہ رجوع کریں۔

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَ يَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَ اِنْ يَّاْتِهِمْ

پھر ان کے پیچھے ایسے ناخلف لوگ آئے جو کتاب کے وارث ہوئے وہ اس ادنیٰ زندگی کا سامان لے لیتے ہیں اور کہتے ہیں ہم کو بخش دیا جائے گا اور اگر ان کے پاس اسی

جو ان کو سخت دکھ دیتے رہیں گے۔ حالانکہ حاکم انسانوں پر بنائے جاتے ہیں اور عذاب بھی انسان کو ہی دیا جاتا ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ ان کی صورتیں بندروں کی سی نہ بنی تھیں بلکہ انسانوں ہی کی رہی تھیں۔

1171 - تَاَذَّنَ۔ اَذِنَ کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 123]۔ اور تَاَذَّنَ کے معنی اَعْلَمَ ہیں یعنی یہ علم دے دیا یا خبر دے دی۔

یہودیوں کے متعلق پیشگوئی:

یہودیوں کے ہاتھ سے حکومت اسلام کے آنے سے پہلے نکل چکی تھی۔ اور جہاں جہاں یہ قوم محکوم ہونے کی حالت میں رہی سخت ذلت کی حالت میں رہی۔ ہاں اسلام کے آنے سے پہلے یہ قوم صرف چند ایک قریب قریب کے ممالک میں ہی آباد تھی۔ اسلام کے بعد دنیا کے تمام ملکوں میں پھیل گئی اور جہاں کہیں رہی حکام وقت کی طرف سے بڑی بڑی خطرناک تکلیفیں اٹھاتی رہی۔ اور اس مصیبت کے متعلق جس کے نیچے اس وقت یہودی تھے قرآن کریم نے یہ پیشگوئی کی کہ آئندہ بھی وہ رہیں گے۔ ہاں ﴿اِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ میں خوش خبری بھی دی کہ کچھ رجوع اللہ تعالیٰ کی طرف کریں تو ان کی بدیوں کو بخش بھی دے گا۔ یعنی اس سزا سے ان کو نکال دے گا۔

عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ؕ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَ دَرَسُوْا مَا فِيْهِ ؕ وَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾

قسم کا سامان اور آ جاتا ہے اسے بھی لے لیتے ہیں۔ کیا ان سے کتاب کے ذریعہ عہد نہ لیا گیا تھا کہ اللہ پر سوائے حق کے کچھ نہ کہیں گے؟ اور جو کچھ اس میں ہے اسے پڑھتے ہیں اور پچھلا گھر ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو تقویٰ کرتے ہیں۔ کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟(1172)

وَ الَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ ﴿۱۷۰﴾

اور جو لوگ کتاب کو مضبوط پکڑتے ہیں اور نماز کو قائم کرتے ہیں ہم کبھی اصلاح کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔

وَ اِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّ ظَنُّوْۤا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اذْكُرُوْا مَا فِيْهِ

اور جب ہم نے ان کے اوپر پہاڑ کو ہلایا گویا وہ سائبان تھا اور انہوں نے خیال کیا کہ وہ ان پر گرنے والا ہے۔ جو کچھ ہم نے تم کو دیا ہے مضبوطی سے پکڑ لو اور جو کچھ اس میں ہے

1172 - خَلْفٌ کے عام معنی پیچھے ہیں۔ لیکن بالخصوص یہ لفظ برے محل پر استعمال ہوتا ہے بمقابلہ خَلَف کے جو اچھی جگہ پر بولا جاتا ہے یعنی خَلْفٌ کے معنی ہیں [اَلْمُتَاْخِرَ لِقَصُوْرِ مَنْزِلَتِهٖ] یعنی ایسا پیچھے آنے والا جو مرتبہ میں گر گیا ہو۔ (غ)

عَرَضَ۔ متاع دنیا کو بھی کہتے ہیں یا ایسے مال کو جس کے لیے ثبات نہ ہو۔ (غ)

يَقُوْلُوْنَ۔ قَوْلٌ یہاں بمعنی اعتقاد ہے یعنی دین کو چھوڑ کر دنیا کو لیتے ہیں اور پھر امید رکھتے ہیں کہ ہم بخشے جائیں گے۔ منہ سے کہنا مراد نہیں۔

﴿مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ﴾ سے مراد وہ میثاق ہے جو کتاب یعنی توریت میں مذکور ہے گویا اضافت بمعنی فی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ پہلے لوگوں میں تو صالح بھی تھے مگر جو پیچھے آئے وہ اکثر ناخلف ہی تھے۔ مال دنیا کے حصول کے لیے دین اور اخلاق کی ان کو پروا نہ رہی۔ اور اعتقاد یہ رکھا کہ گناہ تو اللہ تعالیٰ بخش ہی دے گا۔ لیکن حالت یہ تھی کہ اپنے گناہوں پر اصرار تھا۔ حالانکہ مغفرت کی امید تو اس حال میں رکھنی چاہیے جب انسان گناہ پر اصرار نہ کرے۔ یہ اصول گناہوں کی مغفرت کا بتایا۔ یہ بنی اسرائیل کے قصہ میں مسلمانوں کا نقشہ ہے۔

ع 21 9 11

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ | یاد رکھو تا کہ تم بچ جاؤ۔ (1173)

وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى ۛۚ شَهِدْنَا ۛۚ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ۝

معانقۃ 7

اور جب تیرے رب نے بنی آدم سے (یعنی) ان کی پیٹھوں سے ان کی اولاد نکالی اور ان کو اپنے آپ پر گواہ ٹھہرایا۔ کیا میں تمہارا رب نہیں؟ انہوں نے کہا ہاں! ہم گواہ ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن کہو ہم تو اس سے بے خبر تھے۔ (1174)

1173- نَتَقْنَا۔ نَتْقٌ کے اصل معنی لغت میں [اَلزَّعْزَعَةُ وَالْهَزُّ] ہیں۔ (ل) یعنی ایک چیز کو حرکت میں لانا اور ہلا دینا۔ چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے [وَنَتَقُوْا اَحْلَامَنَا الْاَثَاقِلَا] ہاں اس کے معنی جذب اور اقتلاع بھی آئے ہیں یعنی ایک چیز کا کھینچ لینا اور جگہ سے اکھیڑ دینا۔ لیکن جب [نَتَقْتُ الشَّيْءَ] کے معنی حَرَّكْتُهُ صاف لغت میں موجود ہیں اور ابھی پیچھے رَجْفَةٌ یعنی زلزلہ کا ذکر گزر چکا تو یہی معنی یہاں مراد لیے جائیں گے۔ اس لیے بھی کہ پہاڑ کو جگہ سے اٹھا کر موسیٰ علیہ السلام کے لشکر پر لانا اور پھر ان سے اقرار پابندی معاہدہ لینا اللہ تعالیٰ کے اس قانون کے خلاف ہے جو اپنی شرائع کے بارہ میں اس نے رکھا ہے ﴿فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ﴾ [الکھف: 29:18] ''سو جو کوئی چاہے ایمان لائے اور جو کوئی چاہے انکار کرے۔''

ظُلَّةٌ۔ اس بادل کو کہتے ہیں جو سایہ کرے اور اکثر استعمال اس کا اس میں ہے جسے ناپسند کیا جائے۔ ﴿عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ﴾ [الشعرآء: 189:26] ''بادل والے دن کے عذاب نے۔'' اور اس کی جمع ظُلَلٌ ہے ﴿فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ﴾ [البقرۃ: 210:2] ''بادلوں کے سایوں میں۔'' ﴿وَاِذَا غَشِيَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ﴾ [لقمان: 32:31] ''اور جب انہیں لہر سائبانوں کی طرح ڈھانک لیتی ہے۔'' (غ)

اسی کیفیت کا ذکر کیا ہے جب وہ پہاڑ کے دامن میں تھے اور اوپر سے زور کا زلزلہ آیا جس سے ان کو معلوم ہوا کہ بس پہاڑ ان کے اوپر ہی گر پڑے گا۔

1174- **میثاق فطرت:** یہود کی خلاف ورزیٔ میثاق کا ذکر کرتے ہوئے اس میثاق کا ذکر کیا جس کا تعلق کسی خاص قوم سے نہیں بلکہ فطرت انسانی سے تعلق ہونے کی وجہ سے اس کا دائرہ سب انسانوں پر محیط ہے یعنی فطرت انسانی میں ایک نور رکھا گیا ہے جو اسے حق کی طرف ہدایت کرتا ہے یا جو اللہ تعالیٰ کی ربوبیت پر شہادت دیتا ہے۔ وحی الٰہی اسی نور کی معاون ہو کر اس کی تکمیل کرتی ہے۔ پس یہودیوں کو گویا دونوں طرح پر خطاب کیا۔ اس خاص میثاق کی طرف بھی توجہ دلائی جو ان سے ہوا تھا اور اس فطری میثاق کی طرف بھی جو سب انسانوں سے ہوا اور یوں بھی وحی الٰہی کا مضمون جس پر اس سورت میں خاص بحث ہے نامکمل

اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَ كُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا

یا کہو صرف ہمارے باپ دادا نے پہلے شرک کیا اور ہم ان کے پیچھے (ان کی) اولاد تھے۔ تو کیا تو ہم کو اس کی وجہ

رہتا اگر اس نور فطرت کی طرف توجہ نہ دلائی جاتی جس کو چمکانے کے لیے وحی الٰہی آتی ہے۔

آیا یہ عہد آدم کی ذریت کو یک مرتبہ پیدا کر کے لیا گیا تھا جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے؟ جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس حدیث کی تشریح میں بھی غلطی کی جاتی ہے الفاظ حدیث یہ ہیں [إِنَّ اللهَ خَلَقَ آدَمَ ثُمَّ مَسَحَ ظَهْرَهُ بِيَمِينِهِ، وَاسْتَخْرَجَ مِنْهُ ذُرِّيَّةً، فَقَالَ: خَلَقْتُ هٰؤُلاءِ لِلْجَنَّةِ...الخ] (مسند احمد، جلد1، صفحہ322، حدیث: 318) یعنی ''اللہ نے آدم کو پیدا کیا پھر اس کی پیٹھ کو دائیں ہاتھ سے چھوا، پھر اس سے ایک ذریت نکالی اور کہا ان کو میں نے جنت کے لیے پیدا کیا ہے۔'' ان الفاظ کو اس رنگ میں ظاہر پر محمول کرنا کہ گویا سچ مچ اللہ تعالیٰ کا دایاں ہاتھ بھی تھا جس کے ساتھ اس نے فی الواقع آدم کی پیٹھ کو چھوا صحیح نہیں۔ نہ ہی قرآن وحدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فی الواقع اللہ تعالیٰ نے تمام ارواح انسانی کو پہلے پیدا کر دیا تھا۔ بلکہ اس سے مراد ارواح کی وہ پیدائش ہے جو علم الٰہی میں ہے یا یوں کہو کہ یہ محض عالم مثال کا ذکر ہے۔ کیونکہ فی الحقیقت پیدائش ہر ایک روح کی جسم کے ساتھ ہوتی ہے جیسا کہ صاف فرمایا ﴿ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ﴾ [المؤمنون: 14:23] ''پھر ہم نے اسے ایک اور پیدائش دے کر اٹھا کھڑا کیا۔'' ہاں ہر ایک چیز جو ہونے والی ہے وہ علم الٰہی میں پہلے موجود ہے۔ اس لیے حدیث میں ذکر عالم مثال کا ہے اور یہی بات آیت کے صریح الفاظ سے معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ یہاں آدم کی پیٹھ سے اولاد نکالنے کا ذکر نہیں بلکہ بنی آدم کی پیٹھ سے نکالنے کا ذکر ہے۔ اور پھر ایک طرف تو کہا کہ بنی آدم سے ان کی اولاد نکالی اور دوسری طرف ساتھ ہی بدل کے طور پر فرمایا ﴿مِنْ ظُهُوْرِهِمْ﴾ ان کی پیٹھوں سے۔ پس اس سے مراد ہر ایک نسل کا اپنے آبا کی پیٹھوں سے پیدا ہونا ہے۔ ﴿مِنْ ظُهُوْرِهِمْ﴾ کے لفظ نے صاف بتا دیا کہ اس سے مراد ایک نسل کے بعد دوسری نسل کا پیدا ہونا ہے۔

﴿اَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ﴾ اپنے آپ پر گواہ ٹھہرانے سے مراد یہ ہے کہ دلائل ربوبیت ان کی فطرت میں رکھ دیئے اور عقل انسانی میں ان کو مرکوز کر دیا اور اسی کی طرف حدیث میں اشارہ ہے [كُلُّ مَوْلُودٍ يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ] (صحيح البخاری، كتاب الجنائز، باب مَا قِيلَ فِي أَوْلَادِ الْمُشْرِكِينَ، حديث: 1385) یعنی ''ہر ایک بچہ فطرت صحیحہ پر پیدا ہوتا ہے۔'' اور قرآن کریم میں فرمایا ﴿فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا﴾ [الروم: 30:30] ''اللہ کی پیدا کی ہوئی فطرت جس پر سب لوگوں کو پیدا کیا۔'' پس ان دونوں آیتوں اور حدیث کا مطلب ایک ہی ہے اور ابن جریر میں ایک روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کو سن کر [أَلَا إِنَّهَا لَيْسَتْ نَسَمَةٌ تُولَدُ إِلَّا وُلِدَتْ عَلَى الْفِطْرَةِ] (مسند أحمد، جلد26، صفحہ231) حسن نے فرمایا کہ یوں ہی اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے ﴿وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ﴾ جس سے معلوم ہوا کہ اس آیت سے یہی مطلب انہوں نے بھی نکالا۔ پس ﴿اَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ﴾ میں یہ بتایا کہ فطرت انسانی اس

بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۱۷۳﴾

سے ہلاک کرتا ہے جو غلط کاروں نے کیا؟(1175)

وَ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۷۴﴾

اور اسی طرح ہم کھول کھول کر باتیں بیان کرتے ہیں اور تاکہ وہ رجوع کریں۔

وَ اتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْۤ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۱۷۵﴾

اور ان پر اس شخص کی خبر پڑھ دے جس کو ہم نے اپنی آیات دیں پھر وہ انہیں چھوڑ نکلا تب شیطان اس کے پیچھے لگا سو وہ گمراہوں میں سے ہو گیا۔(1176)

بات کا اقرار کرتی ہے کہ انسان اپنا رب آپ نہیں بلکہ اس کا رب کوئی ذات کامل مستجمع جمیع صفات کاملہ ہے جہاں سے کچھ حصہ انسان بھی پاتا ہے۔

شَهِدْنَا۔ بَلٰی کے ساتھ انسانوں کا قول بھی ہوسکتا ہے۔ یعنی ان کی فطرت اس صداقت کا اقرار کرتی ہے یا یہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے یعنی اس صداقت کی کہ فطرت انسانی اپنے رب کا اقرار کرتی ہے ہم گواہی دیتے ہیں۔

1175- مُبْطِلُوْنَ۔ باطل وہ ہے جس کے لیے کوئی ثبات نہیں۔ اور اِبْطَالٌ کے معنی کسی چیز کو بگاڑ دینا اور اس کو نابود کرنا ہیں۔ اور مُبْطِلٌ سے مراد حق کا ابطال کرنے والا۔ (غ)

اس اعتراض کا جواب کہ تقلید آبدیاں کرنے والے قابل الزام نہیں:

مطلب یہ ہے کہ اصل مُبْطِلٌ یعنی ابطال حق کرنے والے تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے پہلے شرک کر کے اس کی بنیاد رکھی۔ اور پیچھے آنے والی نسل محض ناقل ہے کیونکہ آباؤ اجداد کی تقلید فطرت انسانی میں ہے۔ اس لیے پیچھے آنے والے اپنی بریت ظاہر کرتے ہیں۔ اس کا جواب اسی فطرت انسانی کے میثاق میں ہے یعنی وہ عقل و فطرت جس میں ربوبیت الٰہی مرکوز ہے وہ تو سب انسانوں کو ہم نے یکساں دی ہے۔ اس لیے تقلید غلط کاری کے لیے کوئی حجت نہیں۔

1176- انْسَلَخَ۔ سَلَخٌ حیوان کا چمڑا اتارنے کو کہا جاتا ہے اور اس لیے محض کسی چیز کا کھینچ لینا یا نکال لینا مراد لیا جاتا ہے ﴿نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ﴾ [یٰسٓ: 37:36] ''اس سے ہم دن کو کھینچ لیتے ہیں۔'' اور انْسَلَخَ نکل گیا ﴿فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ﴾ [التوبة: 5:9] ''پھر جب حرمت والے مہینے نکل جائیں۔'' (غ)

اَتْبَعَهُ۔ تَبِعٌ کے معنی پیروی کی اور اَتْبَعَهُ کے معنی ہیں لَحِقَهُ یعنی اسے پالیا یا پکڑ لیا ﴿فَاُتْبِعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ﴾ [الشعرآء: 60:26] ''سو انہوں نے سورج نکلتے ان کا پیچھا کیا۔'' ﴿وَ اَتْبَعْنٰهُمْ فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً﴾ [القصص: 42:28] ''اور ہم نے ان کے پیچھے

وَ لَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَ لٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَ اتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ

اور اگر ہم چاہتے تو ان کے ذریعے سے اس کا مرتبہ بلند کرتے لیکن وہ زمین کے ساتھ لگ گیا اور اپنی خواہش کی پیروی کی۔[1177] سو اس کی مثال کتے کی مثال کی مانند ہے۔ اگر تو اس پر حملہ کرے تو ہانپے اور چھوڑ دے تو ہانپے۔ یہ ان لوگوں کی مثال ہے جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں۔

اس دنیا میں لعنت لگادی۔'' (غ)

اس سے مراد کوئی خاص شخص نہیں گو بعض نے بلعم کا اور بعض نے کسی راہب کا اور بعض نے امیہ کا نام لیا ہے۔ اس کا عام ہونا خود اگلی آیت سے واضح ہے جہاں یہ لفظ صاف ہیں ﴿ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا﴾ یہ ان لوگوں کی مثال ہے جو ہمارے احکام کو جھٹلاتے ہیں۔ پس جس شخص کو احکام الٰہی پہنچیں اور وہ ان کی پروانہ کرے یا ان کو قبول کر کے رد کر دے اس کا وہ نور فطری بھی بجھ جاتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شیطان جو اس کے پیچھے لگا ہوا ہوتا ہے اسے آ پکڑتا ہے۔ پھر جدھر اسے شیطان چلاتا ہے اسی طرف چلتا جاتا ہے۔

1177 - اَخْلَدَ۔ اِخْلَادٌ۔ خُلْدٌ سے ہے اور اس کے معنی کسی چیز کا باقی رکھنا یا اس پر باقی رہنے کا حکم لگانا۔ پس ﴿اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ﴾ کے معنی ہوئے اس کی طرف مائل ہو گیا یہ خیال کرتا ہوا کہ وہ اس میں باقی رہ جائے گا۔ (غ)

ان الفاظ نے لفظ رفع کے معنی جس کی بحث [نمبر: 445] میں گزر چکی ہے پوری وضاحت سے کھول دیئے ہیں۔ یہاں رفع کے بالمقابل ﴿اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ﴾ یا زمین سے پیوست ہو جانے کے لفظ بھی موجود ہیں مگر تاہم نہ رفع سے مراد آسمان پر جانا ہے نہ ﴿اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ﴾ سے مراد سچ مچ زمین سے لگا رہنا ہے۔ بلکہ دونوں جگہ مراد روحانی طور پر رفع اور روحانی طور پر زمین کے ساتھ لگنا ہے۔ یہاں مفسرین نے رَفَعْنَاهُ کے معنی [اِلٰى مَنَازِلِ الْأَبْرَار] کیے ہیں۔ یعنی بلند مراتب کی طرف رفع اور یہاں [رُفِعَ اِلَى السَّمَآءِ] کا نام کوئی نہیں لیتا۔ حالانکہ یہاں تو مذکور بھی نہیں کہ رفع کہا ہوا ہے۔ لیکن جہاں رفع کے ساتھ [اِلَى اللّٰهِ] صاف پڑا ہوا ہے وہاں زبردستی اللہ کو سَمَآءٌ پر بیٹھا ہوا مان کر آسمان پر رفع مراد لیا جاتا ہے یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق۔ یہ ایک غلطی عیسائیت کے مروجہ خیال سے بعض مفسرین کو لگ گئی اور دوسروں نے اس کی پیروی کی۔ ورنہ رفع قرآن کریم میں کہیں بھی جہاں انسانوں کے رفع کا ذکر ہو رفع جسمانی کے معنی میں نہیں آتا۔

فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿١٧٦﴾

سو یہ حال بیان کر دے تا کہ وہ فکر کریں۔ (1178)

سَآءَ مَثَلًا الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ اَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿١٧٧﴾

ان لوگوں کی مثال بری ہے جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں اور اپنے آپ پر ہی وہ ظلم کرتے ہیں۔ (1179)

مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ ۚ وَ مَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿١٧٨﴾

جس کو اللہ ہدایت دے تو وہی ہدایت پانے والا ہے اور جس کو وہ گمراہ چھوڑ دے تو وہ نقصان اٹھانے والے ہیں۔

وَ لَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۫ وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۫ وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿١٧٩﴾

اور یقیناً ہم نے بہت سے جنوں اور انسانوں کو دوزخ کے لیے پیدا کیا ہے۔ اُن کے دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں اور اُن کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں اور اُن کے کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں۔ وہ چار پایوں کی طرح ہیں بلکہ زیادہ گمراہ۔ یہی بے خبر ہیں۔ (1180)

1178 - يَلْهَثْ ۔ لَهَثَ کے معنی ہیں کتے کا زبان نکالنا۔ درآنحالیکہ اس کا سانس تیز ہو رہا ہو پیاس سے ہو یا تھک جانے سے۔ (غ)

کتے کی مثال:

ایسے لوگوں کی مثال جو احکام الٰہی کو جھٹلاتے ہیں کتے سے دی ہے جو ہر حال میں ہانپتا ہے خواہ کوئی اس پر حملہ کرے یا نہ کرے۔ گویا قلق اور اضطراب ہر وقت ایسے انسان کے لیے لاحق حال رہتا ہے اور اطمینان قلب اسے کسی حال میں میسر نہیں آتا۔ احکام الٰہی یا وحی الٰہی کی غرض تو یہی ہے کہ انسان کو سکون یعنی اطمینان قلب حاصل ہو۔ پس اس کا رد کرنا لازماً موجب قلق و اضطراب ہے اور اطمینان قلب صرف ذکر اللہ سے میسر آتا ہے۔ ﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ﴿٢٨﴾﴾ [الرعد: 13:28]
''سن رکھو اللہ کے ذکر سے ہی دلوں کو اطمینان ملتا ہے۔''

1179 - مَثَلًا ۔ بطور تمیز واقع ہوا ہے اور اصل ترکیب یوں ہے [سَآءَ مَثَلًا ۔ مَثَلُ الْقَوْمُ الَّذِيْنَ۔]

1180 - **جہنم کے لیے انسانوں کا پیدا کرنا:** قرآن کریم کی بہترین تفسیر خود قرآن سے ہی ہوتی ہے جو فرماتا ہے ﴿وَ مَا خَلَقْتُ

وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ وَ ذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْۤ اَسْمَآىِٕهٖ ؕ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۰﴾

اور اللہ کے سب اچھے نام ہیں سو ان کے ساتھ اس کو پکارو اور ان کو چھوڑ دو جو اس کے ناموں میں ٹیڑھی راہ چلتے ہیں۔ انہیں اس کا بدلہ دیا جائے گا جو وہ کرتے تھے۔ (1181)

الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾ [الذاریات: 56:51] یعنی ''جن و انس کو پیدا کیا تو صرف اس غرض کے لیے کہ وہ عبادت کریں۔'' پس جہنم کے لیے پیدا کرنا غرض پیدائش نہیں ہوسکتی۔ اس لیے جیسا کہ روح المعانی میں ہے اکثر مفسرین نے یہاں لام کو لام عاقبت کہا ہے جیسے ﴿فَالْتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّ حَزَنًا﴾ [القصص: 8:28] ''پس فرعون کے لوگوں نے اسے اٹھالیا تا کہ وہ ان کے لیے دشمن اور (موجب) غم ہو۔'' یعنی ان کا انجام یہ ہے کہ وہ جہنم میں جاتے ہیں۔ جس طرح شاعر کہتا ہے [لِدُوْا لِلْمَوْتِ وَابْنُوْا لِلْخَرَابِ] ''موت کے لیے اولاد پیدا کرو اور ویران ہونے کے لیے عمارتیں بناؤ۔'' مطلب یہ نہیں کہ ان میں تمہاری غرض یہ ہے بلکہ انجام تو یہی ہے جو پیدا ہوگا وہ مرے گا جو عمارت بنی سو ایک دن ویران ہوگی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے ان کو پیدا کیا (اور پیدا کرنے کی غرض بھی دوسری جگہ عبادت بتادی) مگر نتیجہ یہ ہے کہ وہ گویا جہنم کے لیے ہی پیدا ہوئے تھے۔ کیوں؟ اس لیے کہ دل اور کان اور آنکھ سے کام نہیں لیتے یعنی اس لیے کہ کام ایسے کرتے ہیں جن کا نتیجہ جہنم ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ آیا وہ لوگ برے عمل اس لیے کرتے ہیں کہ خدا نے ان کو پہلے ہی جہنم کے لیے پیدا کیا یا وہ جہنم کے لیے اس واسطے پیدا ہوئے کہ وہ برے کام کرتے ہیں۔ سو قرآن شریف کا ایک ایک لفظ اس پر شاہد ہے کہ کوئی شخص اس لیے برے عمل نہیں کرتا کہ خدا نے اس کو کوئی الگ قسم کے قوی کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ یہاں بھی یہی بات فرمائی کہ ان کو بھی وہی دل دیئے ہیں جو دوسروں کو مگر دوسرے ان سے سمجھ کا کام لیتے ہیں وہ نہیں لیتے۔ یوں نہیں فرمایا کہ ہم نے ان کو دل دیئے مگر فقاہت سے خالی۔ یہ تو اللہ تعالیٰ پر اعتراض ہوتا۔ اس لیے فرمایا کہ دل بھی ہیں اور فقاہت کی قوت بھی ان میں ہے مگر وہ خود اس قوت فقاہت سے کام نہیں لیتے۔ ایسا ہی ان کو دوسروں کی طرح آنکھ اور کان دیئے مگر وہ خود ان سے دیکھنے اور سننے کا کام نہیں لیتے۔ یہ نہیں کہ ان میں دیکھنے یا سننے کی قوت نہیں۔ شرف انسانیت یہی تھا کہ انسان سن کر اور دیکھ کر اور سمجھ کر ان نتائج پر پہنچتا جن پر حیوان نہیں پہنچ سکتا۔ اس شرف کو انہوں نے گنوادیا اس لیے چارپایوں کی طرح ہوگئے۔ آخر پر ان کو غافل اس لیے کہا کہ قصور ان کا اپنا ہے کہ وہ اصل مقصد زندگی سے یا شرف انسانیت سے بے خبر ہیں وہ چاہتے تو خبردار ہوسکتے تھے۔

1181 - اَلْاَسْمَآءُ۔ وہ الفاظ جو معانی مختلفہ پر دلالت کریں یا صفات بھی معنی لیے جاسکتے ہیں۔ پہلے معنی کے لحاظ سے بھی مراد ان کا مفہوم احسن ہونا ہی ہے۔

يُلْحِدُوْنَ ۔ اَلْحَدَ کے معنی ہیں حق سے باطل کی طرف مائل ہوا۔ [اَلْحَادُ فِي الْاَسْمَآءِ] سے مراد اس کی طرف ایسی صفات

وَ مِمَّنْ خَلَقْنَاۤ اُمَّةٌ یَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَ بِهٖ یَعْدِلُوْنَ ۟ع ﴿۱۸۱﴾	اور ان میں جنہیں ہم نے پیدا کیا ایک گروہ ہے جو سچی راہ بتاتے ہیں اور اسی پر انصاف کرتے ہیں۔(1182)
وَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ ۟ۚ ﴿۱۸۲﴾	اور جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ہم ان کو تدریجاً پکڑیں گے جہاں سے وہ جانتے بھی نہیں۔(1183)

ع 22 10 12

منسوب کرنا ہے جو صحیح نہیں یا اس کی شان کے شایاں نہیں۔(غ)

اسمائے الٰہی سے حصول کمال:

یہاں اسمائے الٰہی کا ذکر اس لیے کیا کہ انہی اسماء سے ہی انسان کمال کو حاصل کرتا ہے گویا جس اللہ تعالیٰ کے اسم کو پکارتا ہے اسی کمال کو اپنے اندر بھی چاہتا ہے اور ہر ایک غلط عقیدہ کسی اسم الٰہی میں الحاد سے پیدا ہوتا ہے اور غلط عقیدہ سے خراب عمل پیدا ہوتا ہے۔

1182- ﴿اُمَّةٌ یَّهْدُوْنَ﴾ کی تفسیر خود نبی کریم ﷺ سے مروی ہے [هٰذِهٖ أُمَّتِيْ] یعنی میری امت۔[آیت نمبر: 159] سے مقابلہ کر کے جہاں ﴿مِنْ قَوْمِ مُوْسٰۤى اُمَّةٌ یَّهْدُوْنَ﴾ فرمایا۔ اسی نتیجہ کی تائید ہوتی ہے گویا وہاں قوم موسیٰ کا ذکر ہے تو یہاں امت محمدیہ کا۔

1183- سَنَسْتَدْرِجُهُمْ۔ دَرَجَةٌ۔ مَنْزِلَةٌ کی طرح ہے لیکن اوپر چڑھنے کے لحاظ سے اور اس سے مراد بلند مرتبہ بھی لیا جاتا ہے ﴿لِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ﴾[البقرۃ: 228:2] ''اور مردوں کو ان پر ایک فضیلت ہے۔'' ﴿هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ﴾[آل عمران: 163:3] ''وہ اللہ کے نزدیک درجے (رکھتے) ہیں۔'' اور دَرَجَ کتاب یا کپڑے کے لپیٹنے کو کہا جاتا ہے اور جو لپیٹا جائے اسے بھی دَرَج کہا جاتا ہے اور اس لیے استعارۃً موت کو بھی دَرَج کہا جاتا ہے اسی سے اِسْتِدْرَاجٌ ہے جس سے مراد ہے ان کا لپیٹ لینا جس طرح کتاب لپیٹ لی جاتی ہے۔ گویا ان کی حالت غفلت کا ذکر ہے اور اِسْتِدْرَاجٌ کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ان کو تَدْرِیْجٌ سے یعنی آہستہ آہستہ پکڑیں۔ گویا وہ تھوڑا تھوڑا کر کے اپنی ہلاکت کے قریب آتے جاتے ہیں۔(غ)

ہلاکت میں تدریج:

اس رکوع میں آنحضرت ﷺ کے مخالفین کے انجام کا ذکر ہے۔ کیونکہ جب نبوت اور اس کی ضرورت پر مفصل بحث ہو چکی تو اب اس قوم کا ذکر ضروری تھا جو حق کو نابود کرنا چاہتی تھی۔ تو اس کے متعلق فرمایا کہ ہم آہستہ آہستہ ان کو ہلاکت کی طرف لے جائیں گے اور ان کا نہ جاننا اس لحاظ سے ہے کہ جب ایسی حالت ہوتی ہے تو حق کے مخالف اس مخالفت کے نشہ میں اس قدر سرشار ہوتے ہیں کہ وہ آتی ہوئی ہلاکت کو محسوس بھی نہیں کرتے۔ یہ مکی سورت ہے بعینہ اسی طرح مدینہ میں جا کر اعدائے حق کی مخالفت کا انجام ہوا۔ ایسے رنگ میں کہ محسوس بھی نہیں کرتے تھے۔ حق کے مخالف اپنی تباہی کا سامان اپنے ہاتھوں سے کرتے ہیں مگر

وَ اُمْلِیْ لَهُمْ ؕ اِنَّ كَیْدِیْ مَتِیْنٌ ﴿۱۸۳﴾

اور میں ان کو مہلت دیتا ہوں، میری تدبیر مضبوط ہے۔ (1184)

اَوَ لَمْ یَتَفَكَّرُوْا ۗ مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۱۸۴﴾

اور کیا انہوں نے فکر نہیں کیا کہ ان کے رفیق کو جنون نہیں ہے۔ وہ صرف کھلے طور پر ڈرانے والا ہے۔ (1185)

اَوَ لَمْ یَنْظُرُوْا فِیْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ ۙ وَّ اَنْ عَسٰۤی اَنْ یَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ۚ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۭ بَعْدَهٗ یُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۵﴾

اور کیا انہوں نے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت میں نظر نہیں دوڑائی؟ اور جو چیز اللہ نے پیدا کی ہے اور یہ کہ شاید ان کا وقت نزدیک آ گیا ہو۔ سو اس کے بعد کس بات پر ایمان لائیں گے؟

مَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِیَ لَهٗ ؕ وَ یَذَرُهُمْ فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ ﴿۱۸۶﴾

جس کو اللہ گمراہ قرار دے اس کے لیے کوئی ہادی نہیں اور وہ اُن کو اُن کی سرکشی میں چھوڑتا ہے، اندھے ہو رہے ہیں۔

ایسے تدریج کے ساتھ پکڑے جاتے ہیں کہ وہ ہلاکت آتی ہوئی بھی ان کو نظر نہیں آتی۔

1184 - مَتِیْنٌ۔ مَتْنٌ بلند اور سخت زمین کو کہتے ہیں گویا وہ پیٹھ کی دونوں طرف سے مشابہہ ہے اس لیے مَتُنَ کے معنی ہیں مضبوط ہوا۔ اسی سے متین ہے۔ (غ)

مطلب یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ ایک چھوٹے دل کے انسان کی طرح نہیں کہ ذرا کسی نے مخالفت کی تو فوراً پکڑ لیا۔ بلکہ وہ مہلت دیتا ہے اس لیے کہ انسان کی طرح اس کو یہ فکر نہیں کہ شاید پھر میرے قابو میں نہ آ سکے۔ بلکہ خدا تعالیٰ کی تدبیر بڑی مضبوط ہوتی ہے اور انسان اپنے اوپر قیاس کر کے جب ایک جرم پر ایک دفعہ نہیں پکڑا جاتا تو سمجھ لیتا ہے کہ پکڑنے والا ہی کوئی نہیں۔

1185 - جِنَّةٍ۔ جَنٌّ کے معنی ڈھانکنا اور جِنَّةٍ جنوں کی جماعت کو بھی کہتے ہیں جیسے ﴿مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ﴾ [الناس: 6:114] ''جنوں اور انسانوں میں سے۔'' ﴿وَ جَعَلُوْا بَیْنَهٗ وَ بَیْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا﴾ [الصافات: 158:37] ''اور اس کے اور جنوں کے درمیان ناطہ تجویز کرتے ہیں۔'' اور جنون کو بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ نفس اور عقل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ (غ)

رسول کو جنون نہیں ہوتا:

رسول تو بدی کے بدانجام سے ڈراتا ہے اور یہ کوئی جنون کی بات نہیں۔ قرآن کریم میں غور کرتے تو معلوم ہوتا کہ یہ کسی بلند مقام

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ۚ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَاۤ اِلَّا هُوَ ۚ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ؕ يَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

وقف منزل

وقف لازم

تجھ سے اس گھڑی کے متعلق پوچھتے ہیں کہ اس کا واقع ہونا کب ہوگا؟ کہہ اس کا علم تو میرے رب کو ہی ہے اس کو اس کے وقت پر کوئی ظاہر نہیں کرے گا مگر وہی۔ وہ آسمانوں اور زمین میں بھاری بات ہے۔ تم پر اچانک ہی آئے گی۔ تجھ سے پوچھتے ہیں گویا کہ تو اس کے متعلق کاوش کرنے والا ہے۔ کہہ اس کا علم صرف اللہ کو ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (1186)

پر پہنچانا چاہتا ہے اور یہ کام مجنون کا نہیں ہوتا۔ یہ کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ انہی لوگوں کو مجنون کہا گیا ہے جو انسان کو بلند سے بلند مقام پر پہنچانا چاہتے ہیں اور بدی کے بدانجام سے ڈراتے ہیں۔ حالانکہ بدی کا انجام بد ہونے پر کل دنیا کا تجربہ شاہد ہے۔

1186 - مُرْسٰی۔ رَسَا کے معنی ایک چیز مضبوط ہوگئی، گڑ گئی اور اَرْسٰی اسے مضبوط یا قائم کر دیا ﴿قُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ﴾ [السبأ: 13:34] گڑی ہوئی دیگیں ﴿رَوَاسِيَ شٰمِخٰتٍ﴾ [المرسلات: 27:77] ''بڑے بڑے اونچے پہاڑ بنائے۔'' جہاں رَوَاسِيَ جمع ہے اور مراد پہاڑ ہیں بوجہ مضبوطی کے جیسا کہ فرمایا ﴿وَ الْجِبَالَ اَرْسٰىهَا﴾ [النازعات: 32:79] ''اور پہاڑوں کو مضبوط بنایا۔'' اور مُرْسٰی مصدر بھی ہے اور اسم مکان اور زمان اور مفعول بھی۔ یہاں مراد اس کے قائم ہونے کا زمانہ ہے اور ﴿بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَ مُرْسٰىهَا﴾ [هود: 41:11] ''اللہ کے نام سے اس کا چلنا اور اس کا لنگر ڈالنا ہے۔'' کشتی کا ٹھہرنا یا لنگر کا ڈالنا۔ (غ)

يُجَلِّيْ۔ جَلْوَ سے ہے جس کے معنی کھلے طور پر ظاہر کر دینا ہیں یہی معنی تَجَلِّيَةٌ کے ہیں۔

ثَقُلَتْ۔ ثَقَلَ یا بوجھ کا لفظ اصل اجسام پر بولا جاتا ہے لیکن معانی میں بھی اس کا استعمال ہے ﴿فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ﴾ [القلم: 46:68] ''تو وہ چٹی کے بوجھ سے دبے ہوئے ہیں۔'' اور [ثَقُلَ الْقَوْلُ] اس بات کو کہا جاتا ہے جس کا سننا پسند خاطر نہ ہو۔ اسی لحاظ سے یہاں ساعت پر ثَقُلَتْ بولا ہے۔ (غ)

حَفِيٌّ۔ اِحْفَآء کے معنی ہیں سوال میں الحاح کرنا یا کسی چیز کا حال معلوم کرنے میں زیادہ کاوش میں لگے رہنا۔ (غ)

یہاں السَّاعَةِ سے کیا مراد ہے؟ [نمبر: 931] میں دکھایا گیا ہے کہ ساعتیں یا قیامتیں تین ہیں: صغریٰ، وسطیٰ، کبریٰ۔ ساعت وسطی ایک قوم کی تباہی کا وقت ہے۔ اب ظاہر ہے کہ یہاں اوپر ذکر صاف الفاظ میں اعدائے حق کے پکڑا جانے کا ہے۔ جیسا کہ رکوع کے شروع کی آیتوں میں صفائی سے فرمایا۔ تو پس جب ان کو استدراج کی خبر دی گئی اور یہ کہ ان کو تھوڑے وقت کے لیے مہلت دی جاتی ہے تو وہ سوال کرتے ہیں کہ یہ ہماری تباہی اور ناکامی کا وقت کب آئے گا۔ کیونکہ اس وقت وہ زوروں

قُلْ لَّاۤ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا اِلَّا
مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَ لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ
لَا سْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ ۛۚ وَ مَا مَسَّنِیَ
السُّوْٓءُ ۛۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ وَّ بَشِیْرٌ لِّقَوْمٍ
یُّؤْمِنُوْنَ ۠ ۱۸۸

معانقۃ 8

ع 23 7 13

کہہ، میں اپنی جان کے لیے نفع کا مالک نہیں اور نہ نقصان کا مگر جو اللہ چاہے۔ اور اگر میں غیب جانتا ہوتا تو بہت بھلائی لے لیتا اور مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچتی۔ میں صرف ڈرانے والا ہوں اور ان لوگوں کو خوشخبری دینے والا جو ایمان لاتے ہیں۔ (1187)

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ
جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِیَسْكُنَ اِلَیْهَا ۚ
فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِیْفًا
فَمَرَّتْ بِهٖ ۚ فَلَمَّاۤ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ
رَبَّهُمَا لَىِٕنْ اٰتَیْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ

وہی ہے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا تا کہ وہ اس سے آرام حاصل کرے۔ پھر جب وہ اس پر پردہ ڈالتا ہے تو وہ ایک ہلکا سا بوجھ اٹھا لیتی ہے اور اس کے ساتھ چلتی پھرتی ہے۔ پھر جب وہ بوجھ معلوم کرتی ہے دونوں اللہ اپنے رب کو پکارتے ہیں کہ

پر تھے۔ اس کا جواب یہ دیا کہ کب وہ وقت آئے گا اس کے بتانے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اوپر بتا دیا تھا کہ آہستہ آہستہ اور تدریجاً آئے گا۔ ہاں یہ فرمایا کہ وہ کوئی ایسی آسان شے نہیں جس کے متعلق تم بار بار جلدی کرتے ہو اور اس کا ثقیل ہونا اس لحاظ سے بھی ہے کہ وہ اس قوم کے لیے ایک امر ناخوشگوار ہے اور اس لیے بھی کہ اسے دوسری جگہ ﴿خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ۝﴾ [الواقعة: 56:3] ''(وہ کسی کو) نیچا کرنے والی (کسی کو) بلند کرنے والی (ہے)۔'' کہا ہے یعنی بعض یعنی کفار کو ذلیل کر دے گی اور بعض یعنی مومنوں کو بلند مقام پر پہنچا دے گی۔

1187 - مخالفین کو ان کے بد انجام سے ڈرانے کے بعد قبول کرنے والوں کو خوشخبریاں سنا کر پھر بھی یہی فرمایا کہ رسول عالم الغیب نہیں۔ جس قدر اللہ تعالیٰ نے ظاہر کر دیا ہے اس قدر سنا دیا اپنے لیے بشر سے بڑھ کر طاقت کا دعویٰ نہ کرنا دکھا تا تھا کہ کس قدر سادگی آپ کے اصول دین میں تھی۔ سب کچھ سنا تو دیا مگر یہ بھی بتا دیا کہ حق کو حق کی خاطر قبول کرو نہ اس لیے کہ بہت سی آسائش مل جائے۔ **اسلام کے اصول کی کامیابی کا اصل راز ان کی سادگی ہے** اور شروع سے ہی یہ رنگ نظر آتا ہے۔ صاحب انجیل کی طرح بڑے بڑے دعوے نہیں کہ میں یہ ہوں اور میں وہ ہوں۔ مگر کام اتنا بڑا کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کام اس کے سامنے کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتا۔

مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۸۹﴾

اگر تو ہمیں صحیح وسالم (بچہ) دے تو ہم ضرور شکر کرنے والوں میں سے ہوں گے۔ (1188)

فَلَمَّآ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰىهُمَا ۚ فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۹۰﴾

پھر جب وہ ان کو صحیح وسالم (بچہ) دیتا ہے وہ اس میں جو ان کو دیا اس کے شریک ٹھہراتے ہیں سو اللہ اس سے بلند ہے جو وہ شریک بناتے ہیں۔

اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْـًٔا وَّ هُمْ يُخْلَقُوْنَ ﴿۱۹۱﴾

کیا وہ اس کو شریک بناتے ہیں جو کچھ بھی پیدا نہیں کر سکتے اور وہ خود پیدا کیے جاتے ہیں؟

1188 - تَغَشّٰىهَا۔ غَشِيَ کے اصل معنی ستر یعنی ڈھانک دینا یا پردہ ڈالنا ہیں ﴿وَ اِذَا غَشِيَهُمْ مَّوْجٌ﴾ [لقمان: 32:31] ''اور جب انہیں لہر ڈھانک لیتی ہے۔'' ﴿فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ۟﴾ [طٰہٰ: 78:20] ''سو دریا نے انہیں جیسے ڈھانکنا تھا ڈھانک لیا۔'' ﴿اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ۙ﴾ [النجم: 16:53] ''جب سدرہ پر چھا رہا تھا جو چھا رہا تھا۔'' وغیرہ اور کنایۃً اس سے مراد جماع لیا جاتا ہے۔ (غ)

صَالِحًا۔ صَلَاحٌ۔ فساد کی ضد ہے اس لیے صالح بلحاظ افعال بھی ہوسکتا ہے یعنی اس کے افعال میں کوئی فساد نہ ہو اور بلحاظ جسم بھی یعنی جس کے جسم میں کوئی نقصان نہ ہو اور یہی یہاں مراد ہے۔ اس لیے کہ بچہ کی صلاحیت اس کے جسم کے لحاظ سے ہی ہوسکتی ہے۔ اس رکوع میں یہ بتایا ہے کہ مخالفت میں کیا طریق اختیار کرنا چاہیے۔ مگر پہلے بتایا ہے کہ انسان کس طرح ناشکری اختیار کرتا ہے جب دکھ اور تکلیف کا وقت ہوتا ہے تو خدا کو پکارتا ہے جب آسائش اور نعمت حاصل ہو جاتی ہیں تو پھر خدا کے ساتھ شریک ٹھہرانے لگتا ہے۔

آدم کی طرف شرک کی نسبت غلط ہے:

یہاں لفظ تو عام ہیں مگر ﴿نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ﴾ کے لفظ نے بہت لوگوں کو اس طرف مائل کر دیا کہ یہاں آدم وحوا کا ذکر ہے حالانکہ کسی حدیث میں یہ نہیں۔ اور دوسری طرف الفاظ کو عام رکھنے سے کوئی محذور لازم نہیں آتا۔ کیونکہ جو انسان پیدا ہوتا ہے وہ ایک ہی نفس سے پیدا ہوتا ہے اور بی بی یا جوڑے کا اسی نفس سے پیدا ہونا صرف حوا کے لیے مخصوص نہیں بلکہ تمام انسانوں کو یہی کہا ہے کہ تم سب کی بیبیوں کو تمہارے ہی نفسوں سے پیدا کیا ہے ﴿وَ مِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَيْهَا﴾ [الروم: 21:30] ''اور اس کے نشانوں میں سے ہے کہ تمہارے لیے تمہارے نفسوں سے جوڑے پیدا کیے تا کہ تم ان سے تسکین پاؤ۔'' جہاں سارے لفظ وہی ہیں جو یہاں ہیں۔ پس آدم وحوا پر ان کا لگانا اور اس پر یہ قصے بڑھانا کہ آدم وحوا کی اولاد نہ جیتی

وَ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّ لَاۤ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۲﴾

اور وہ اُن کی مدد نہیں کر سکتے اور نہ ہی اپنی مدد کر سکتے ہیں۔

وَ اِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ ؕ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ ﴿۱۹۳﴾

اور اگر تم ان کو ہدایت کی طرف بلاؤ تو وہ تمہاری پیروی نہیں کرتے تمہارے لیے یکساں ہے کہ تم ان کو پکارو یا تم چپکے رہو۔ (1189)

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾

وہ جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو تمہاری طرح بندے ہیں سو ان کو پکارو تو چاہیے کہ تم کو جواب دیں اگر تم سچے ہو۔ (1190)

اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَاۤ اَمْ لَهُمْ

کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے وہ چلتے ہیں یا ان کے

تھی۔ تب انہوں نے ایک بچہ کا نام عبدالحارث رکھا ور حارث شیطان کا نام ہے، سب بے بنیاد باتیں ہیں۔ اور محقق مفسرین نے ان کو رد کیا ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ان آیات میں بت پرستی کے شرک کا ذکر ہے جیسا کہ [نمبر: 195] میں واضح کر دیا ہے اور کم از کم بت پرستی کی ابتدا حضرت آدم علیہ السلام کی طرف آج تک کسی نے منسوب نہیں کی۔

1189 - اس آیت میں خطاب مشرکوں کو ہے جیسا کہ اگلی آیت سے واضح ہوتا ہے اور ان کو بتوں کی بے بسی کی طرف توجہ دلائی ہے اور هُدٰی سے مراد حصول کامیابی کی راہ ہے اور اتباع یا پیروی کرنے سے مطلب حصول مراد میں امداد دینا ہے ﴿سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ﴾ اس کو واضح کرتا ہے کیونکہ اگر دعوت الی الحق مراد ہو اور خطاب مسلمانوں کو ہو تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ تمہارے لیے ان کا بلانا نہ بلانا یکساں ہے۔ دعوت الی الحق سے بہر حال بلانے والے کو فائدہ پہنچتا ہے۔

1190 - **بتوں کا عبد ہونا:** بتوں کو ﴿عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ﴾ اس لحاظ سے کہا کہ وہ انسان کی طرح بندگی یا عاجزی کی حالت میں ہیں، مسخر ہیں، محکوم ہیں یا اس لیے کہ بت انسانوں کی صورت پر بنائے جاتے تھے۔ یا انسانوں کی یادگار کے طور پر۔ تو مطلب یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ وہ تمہاری طرح عباد ہیں اور یہ جو فرمایا کہ تم دعا کرو تو پھر چاہیے کہ وہ جواب دیں (یا قبول کریں) تو اس سے معلوم ہوا کہ خدا ضرور دعا قبول کرتا ہے بلکہ اس کا جواب بھی دیتا ہے اور موحد اور مشرک میں فرق یہی ہے کہ موحد اس ہستی کو پکارتا ہے جو دعاؤں کا جواب دیتی ہے اور مشرک جن کو پکارتا ہے وہ جواب نہیں دیتے۔

اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ ۫ اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَآ ۫ اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۱۹۵﴾

ہاتھ ہیں جن سے وہ پکڑتے ہیں یا ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے ہیں یا ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے ہیں؟ کہہ اپنے شریکوں کو پکارو پھر میرے خلاف تدبیریں کرو اور مجھے کبھی مہلت نہ دو۔ (1191)

اِنَّ وَلِيِّۦَ اللّٰهُ الَّذِيْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ ۖ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۹۶﴾

میرا ولی اللہ ہے جس نے کتاب اتاری اور وہی نیکوں کی حمایت کرتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۷﴾

اور جن کو تم اس کے سوا پکارتے ہو وہ تمہاری مدد نہیں کر سکتے اور نہ اپنی ہی مدد کر سکتے ہیں۔ (1192)

1191 - یعنی مشرکوں کی اور ان کے فرضی خداؤں کی مخالفت حق کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ مکہ میں سورۂ اعراف کے نزول کا زمانہ وہ ہے جب مخالفت زور پر ہے اور ساتھی اول تو تعداد میں کچھ نہیں جو ہیں وہ بھی متفرق۔ پھر وطن سے بے وطن۔ مگر کس قدر تحدی ہے کہ سارا زور لگا لو، ساری تدبیریں میری ہلاکت کی کر لو، مجھے کوئی مہلت بھی نہ دو۔ ایک بے کس انسان جو چاروں طرف سے ستایا جا رہا ہو، جس کی زندگی معرض خطر میں ہو جس کے چاروں طرف دشمن ہی دشمن ہوں ایسے لفظ منہ سے نہیں نکال سکتا۔ یہ پرشوکت الفاظ اسی خدائے قادر کے منہ سے نکلے ہوئے ہیں جس کے سامنے انسانوں کی مخالفت کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ جس کے مقابلہ پر ساری دنیا اگر کوشش کرے تو ناکام ہوتی ہے۔ ایسی بے کسی کی حالت میں اس قدر **پرشوکت تحدیانہ دعویٰ** جو ساری دنیا کو مخالفت کے لیے بلا رہا ہو ثابت کر رہا ہے کہ وحی کے الفاظ نہ محمد رسول اللہ ﷺ کے بنائے ہوئے ہیں نہ آپ کے قلب کا نقشہ ہیں۔ بلکہ یہ کوئی خارجی شے ہے جو انتہائی درجہ کی بے کسی کے وقت مہبط وحی کی قوت کا باعث ہو رہی ہے۔ اگر آج بھی مسلمانوں کو اس کلام پر ایمان ہوتا تو وہ حالات پیش آمدہ میں اتنے مایوس نہ ہوتے۔ سب سے بڑی مایوسی جو آج مسلمانوں کے دلوں میں ہے وہ اسلام کے غلبہ کے متعلق ہے نہ اس امر کے متعلق کہ مسلمانوں کو بادشاہت نہیں ملے گی۔ اسی لیے اشاعت اسلام کے عظیم الشان مقصد کی طرف ان کا قدم نہیں اٹھتا۔ جب دل بیٹھے ہوئے ہوں تو قدم کس طرح اٹھے؟

1192 - اوپر کی آیات میں تو یہ بتایا تھا کہ وہ آنحضرت ﷺ کے خلاف سارا زور لگا کر بھی آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ یہاں بتایا کہ نہ صرف یہی بلکہ جب مشرک مغلوب ہوں گے تو یہ بت ان کی کچھ مدد نہ کر سکیں گے۔ ان کی مدد کرنا تو ایک طرف رہا اپنے آپ کو

وَ اِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا ؕ وَ تَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَ هُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۹۸﴾

اور اگر تم ان کو ہدایت کی طرف بلاؤ تو وہ نہ سنیں اور تو اُن کو دیکھے گا کہ تیری طرف دیکھ رہے ہیں حالانکہ وہ دیکھتے نہیں۔ (1193)

خُذِ الْعَفْوَ وَ اْمُرْ بِالْعُرْفِ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۱۹۹﴾

درگزر اختیار کر اور نیک کام کا حکم دے اور جاہلوں سے کنارہ کر۔ (1194)

وَ اِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۰۰﴾

اور اگر شیطان کی فساد کی بات تجھے تکلیف دے تو اللہ کی پناہ پکڑ وہ سننے والا جاننے والا ہے۔ (1195)

بھی تباہی سے نہ بچا سکیں گے۔ یوں نہایت صفائی سے یہ بتا دیا کہ انجام کار مشرک مغلوب ہوں گے اور ان کے بتوں کی صفائی ہو جائے گی۔ یہی وہ بات تھی جس نے آخر کار ابوسفیان اور دیگر اہل مکہ پر اثر کیا کہ کس طرح جو کچھ بے کسی کی حالت میں رسول اللہ ﷺ کے منہ سے کہلوایا گیا تھا وہ حرف بحرف پورا ہوا اور مشرک باوجود اپنی ساری طاقت کے آخر کار مغلوب ہوئے۔

1193 - اس آیت میں یا اس کے پچھلے حصہ میں خطاب بدل دیا ہے یعنی مسلمانوں کو خطاب ہے کہ اگر تم ان کفار کو ہدایت کی طرف بلاؤ تو یہ بھی نہیں سنتے۔ یہاں سننے سے مراد قبول کرنا ہے اور اسی طرح پر نظر تو تیری طرف کرتے ہیں مگر دیکھتے نہیں۔

1194 - یہاں عفو کے معنی [مَا عَفَا وَ سَهَلَ وَ تَيَسَّرَ مِنْ اِخْلَاقِ النَّاسِ] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا و مجاہد سے مروی ہیں۔ یعنی جو کچھ لوگوں کے اخلاق سے آسانی سے میسر آئے اور سہل ہو اس کو قبول کر لو، اس پر راضی ہو جاؤ اور ان پر مشقت نہ ڈالو۔ لیکن یہاں صاف ذکر مخالفین کا ہے اور **عفو سے مراد صاف یہی ہے کہ جو مخالفت کرتے ہیں، دکھ دیتے ہیں ان کے معاملہ میں تم عفو کرتے جاؤ۔** اور نبی کریم ﷺ نے یہاں تک اس حکم پر عمل کیا کہ فتح مکہ کے وقت بھی جو دنیا دار فاتح کے لیے انتقام کا وقت ہوتا ہے کمال درجہ کا عفو دکھایا۔ پس حکم دیا کہ ان کی مخالفت پر عفو اختیار کرو۔ چنانچہ سلف سے یہ معنی بھی مروی ہیں بلکہ شعبی کی ایک روایت میں خود نبی کریم ﷺ سے یہ معنی مروی ہیں [اَنْ تَعْفُوْا عَنْ ظُلْمِكَ] یعنی جو تم پر ظلم کرتا ہے تم اس پر عفو اختیار کرو۔ ہاں نیک باتوں کے لیے کہتے جاؤ اور جاہل جو معاملہ تمہارے ساتھ کرتے ہیں اس سے اعراض کرتے رہو۔

1195 - يَنْزَغَنَّ۔ نَزْغ کے اصل معنی سوئی یا کسی نوک کا چمڑہ میں داخل کرنا ہیں اس لیے اس کے معنی [دَخُوْلَ فِي الْاَمْرِ لِاَفْسَادُهُ] ہی ہیں یعنی کسی امر میں اس کو بگاڑنے کے لیے مداخلت کرنا۔ چنانچہ قرآن کریم میں دوسری جگہ صاف یہی معنی آئے ہیں ﴿نَزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَ بَيْنَ اِخْوَتِيْ﴾ [یوسف: 100:12] (غ) شیطان نے مجھ میں اور میرے بھائیوں میں فساد ڈلوایا۔ اور

اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ﴿۲۰۱﴾

جو (بدی سے) بچتے ہیں جب ان کو شیطان سے کوئی خیال پہنچتا ہے (خدا کو) یاد کرتے ہیں سو یکایک وہ روشنی حاصل کرنے والے ہو جاتے ہیں۔ (1196)

لسان العرب میں ہے کہ نَزَغَ وہ کلام ہے جس سے لوگوں کے درمیان فساد ڈال دیا جائے اور نَزَغَ الرَّجُلُ کے معنی ہیں ذِكْرَهُ بِقَبِيْحٍ اس کا برے لفظوں میں ذکر کیا اور حدیث میں نَوازِغ کا لفظ آتا ہے جو نَزَغَ بمعنی طعن وفساد سے ہے اور ایک اور حدیث میں ہے: [فَنَزَغَهُ إِنْسَانٌ مِّنْ أَهْلِ الْمَسْجِدِ بِنَزِيْغَةٍ] (غريب الحديث لابن قتيبه، جلد2، صفحه 439) جس کے معنی کیے ہیں [رَمَاهُ بِكَلِمَةٍ سَيِّئَةٍ] یعنی اس کی نسبت برا کلمہ کہا۔ (ن) اور نَزَغَ کے معنی وسوسہ بطور مجاز ہیں اصل معنی نہیں اور نہ ہی وسوسہ یہاں معنی مراد ہو سکتے ہیں۔ اس لیے کہ حدیث میں صاف آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میرا قرین جن مسلمان ہو گیا اور وہ سوائے بھلائی کے اور مجھے کچھ نہیں کہتا [اَعَانَنِي عَلَيْهِ فَاَسْلَمَ، فَلَا يَأْمُرُنِي إِلَّا بِخَيْرٍ] (صحيح مسلم، كتاب صِفَةُ الْقِيَامَةِ وَالْجَنَّةِ وَالنَّارِ، باب تَحْرِيشِ الشَّيْطَانِ وَبَعْثِهِ سَرَايَاهُ لِفِتْنَةِ النَّاسِ وَأَنَّ مَعَ كُلِّ إِنْسَانٍ قَرِينًا، حديث:7286) پس یہاں نزغ شیطان اپنے حقیقی معنی میں ہے یعنی شیطان تیرا کام بگاڑنا چاہے یا تیری نسبت بری باتیں کہتا پھرے اور شیطان سے مراد **انسان شیطان** ہی ہیں جو دن رات آپ کے کام کو بگاڑنے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے اور آپ کے متعلق برے کلمات کہہ کر لوگوں کو آپ کی باتیں سننے سے روکتے تھے۔ تو اس کا علاج بتایا کہ خدا کی پناہ میں آ جاؤ۔ ان شیاطین کے انسان ہونے پر [آیت نمبر: 202] بھی شاہد ہے۔

1196 - طائف کے معنی طواف کرنے والا یا گھومنے والا ہیں ﴿طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ﴾ [البقرة: 125:2] ''میرے گھر کو پاک کر دو طواف کرنے والوں کے لیے۔'' اور خیال یا لمہ پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جیسے یہاں اور حادثہ پر جیسے ﴿فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ﴾ [القلم: 19:68] ''سو اس پر پھر جانے والی (آفت) پھر گئی۔'' اور مجاہد اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہاں غضب مراد ہے۔ (ج) کیونکہ وہ بھی ایک لمہ شیطانی ہے اور بعض نے کہا کہ طائف جنون ہے مگر چونکہ غضب بھی اپنے اندر جنون کا رنگ رکھتا ہے اس لیے اس پر بولا گیا۔

غضب کا علاج:

پچھلی آیت میں ان باتوں کا ذکر کیا تھا جو شریر لوگ آنحضرت ﷺ کے متعلق مشہور کرتے تھے اور آپ کو حکم دیا کہ تم ان کے معاملہ میں عفو سے کام لو اور اللہ کی پناہ چاہو۔ اب اسی بات کو عام کیا ہے اور سب مسلمانوں کو بتایا ہے کہ اگر ان کو دکھ دینے والے کلمات سن کر غضب آئے تو یہ نہیں چاہیے کہ ان کی طبائع انتقام کی طرف مائل ہوں بلکہ اللہ تعالیٰ کو یاد کریں تو غضب فرو ہو جائے گا اور یہاں ﴿طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ﴾ سے مراد غضب ہی ہے جیسا کہ مجاہد سے روایت ہے۔ سیاق عبارت بھی اسی معنی کو چاہتا ہے کیونکہ جب شیاطین کی طرف سے مخالفت ہو گی تو بعض وقت غضب آ ہی جائے گا اور غضب انسان کو اندھا کر دیتا ہے۔

وَ اِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾

اوران کے بھائی بندان کو گمراہی میں بڑھا رہے ہیں۔ پھر وہ کمی نہیں کرتے۔ (1197)

وَ اِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْ لَا اجْتَبَيْتَهَا ؕ قُلْ اِنَّمَاۤ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ ۚ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَ

اور جب تو ان کے پاس کوئی آیت نہیں لاتا کہتے ہیں تو خود اسے کیوں نہیں بنالاتا؟ کہہ میں صرف اس کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب سے میری طرف وحی کیا جاتا ہے یہ تمہارے رب کی طرف سے روشن دلیلیں ہیں اور ہدایت اور

اس لیے اس کا علاج یہ بتایا کہ پھر خدا کو یاد کرو۔ غضب خود فرو ہو جائے گا اور بصارت پیدا ہو جائے گی۔ دعوت الی الحق کا کام کرنے والوں یا مبلغین اسلام کو اس پاک اصول کو کبھی ہاتھ نہ دینا چاہیے، وہ کبھی غضب میں نہ آئیں۔ بلکہ جب واقعات ایسے ہوں جن سے غصہ پیدا ہو تو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں۔ غضب میں آ کر وہ دوسروں کو برا کہیں گے نتیجہ یہ ہوگا کہ حق کے ساتھ تنفر اور بڑھے گا بجائے اس کے اگر نرمی اختیار کی جائے تو اللہ تعالیٰ وہ راہ بھی بتا دے گا جس سے الزام کو دلائل سے دور کر دیا جائے۔ اسی کی طرف لفظ مُبْصِرُوْنَ میں اشارہ ہے۔ مگر آج ہمارے علماء کی یہ حالت ہے کہ غیروں سے تو کیا نرمی سے پیش آئیں گے اگر ایک مسلمان کے منہ سے کچھ خلاف طبیعت سن لیں تو غضب سے آگ ہو جاتے ہیں۔

1197 - اِخْوَانُهُمْ۔ ضمیر شیاطین کی طرف جاتی ہے یعنی شیاطین کے بھائی۔

يَمُدُّوْنَهُمْ۔ مَدّ کے معنی لمبا کیا، مہلت دی۔ گمراہی میں لمبا کرنے سے مراد گمراہی میں بڑھانا ہے۔ راغب نے لکھا ہے کہ مَدَّ بُرے موقعہ پر بولا جاتا ہے اور امداد اچھے موقعہ پر۔ جیسے ﴿وَ اَمْدَدْنٰهُمْ بِفَاكِهَةٍ﴾[الطور: 22:52] ''اور ہم انہیں پھل پے بہ پے دیں گے۔'' ﴿يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ﴾[آل عمران: 125:3] ''تمہارا رب پانچ ہزار سے تمہاری مدد کرے گا۔''

يُقْصِرُوْنَ۔ قصر چھوٹا کرنا ہے اور [اَقْصَرَ عَنْهُ] کے معنی ہیں [كَفَّ مَعَ الْقُدْرَةِ عَلَيْهِ] یعنی باوجود ایک امر پر طاقت رکھنے کے اس سے رک گیا۔ (غ)

شیاطین کے بھائی:

یہاں سے معلوم ہوا کہ ایک تو شیطان ہیں اور دوسرے ان کے بھائی جو گمراہی میں ان کو بڑھاتے ہیں۔ اس لیے شیاطین سے مراد وہ شیطان نہیں ہو سکتے جو بدی کی تحریک کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کو ان کے اتباع گمراہی میں کیا بڑھائیں گے۔ بلکہ شیاطین سے مراد وہی کفار کے رؤسا ہیں جن کا ذکر ﴿وَ اِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ﴾[البقرة: 14:2] میں ہے جب لوگ ان کے پیچھے لگتے ہیں تو پھر وہ گمراہی میں اور ترقی کرتے ہیں اس لیے کہ ان کو معاون مل جاتے ہیں۔ اگر ان کے معاون نہ ہوں تو ان کی شرارتیں

هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰۳﴾ رحمت ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔ (1198)

وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۲۰۴﴾ اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو سنو اور چپ رہو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔ (1199)

خود ہی ختم ہو جائیں۔

1198 - اجْتَبَيْتَهَا۔ جَبٰی کے معنی جمع کرنا ہیں ﴿يُجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ﴾ [القصص: 57:28] ''جس کی طرف ہر طرح کے میوے کھنچے چلے آتے ہیں۔'' اسی لیے بڑے حوض کو جس میں پانی جمع ہوتا ہے جَابِيَةٌ کہا جاتا ہے جس کی جمع جواب ہے ﴿وَ جِفَانٍ كَالْجَوَابِ﴾ [السبأ:13:34] ''اور (بڑے بڑے) لگن جیسے تالاب۔'' اور اللہ تعالیٰ کا اِجْتِبَاء عبد طریق اصطفا پر جمع کرنا ہے اور یہاں اِجْتِبَاء سے مراد یہ ہے کہ خود جمع کر کے کیوں نہیں لے آتا۔ گویا یہ تعریض کی ہے کہ تم تو اختراع کے طور پر ایسی باتیں بنالیا کرتے ہو۔ (غ) اس کا ردّ یوں کیا ہے کہ میں تو صرف وحی کی پیروی کرتا ہوں۔ مجھے خود کہاں اختیار ہے کہ نشان بنالیا کروں۔

1199 - **فاتحہ خلف امام کا مسئلہ:** ظاہر ہے کہ یہاں خطاب کفار سے ہے جن کا قول تھا ﴿لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَ الْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ﴿۲۶﴾﴾ [حٰمٓ السجدة: 26:41] ''اس قرآن کو مت سنو اور اس میں شور ڈال دو تا کہ تم غالب آ جاؤ۔'' مگر اس سے یہ استدلال بھی کیا گیا ہے کہ سورۂ فاتحہ جماعت کی حالت میں مقتدی کو نہ پڑھنی چاہیے۔ چونکہ صریح احادیث موجود ہیں کہ بغیر فاتحہ کے نماز نہیں ہوتی اس لیے یہ استدلال درست نہیں۔

(۱) اول تو مقتدی کے فاتحہ پڑھنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ امام کی قراءت فاتحہ کو سنتا نہیں۔ کیونکہ ہر آیت پر جب امام وقفہ کرتا ہے تو اس وقفہ میں مقتدی اس فقرہ کو دہرا سکتا ہے اور سورۂ فاتحہ کی آیات ایسی چھوٹی واقع ہوئی ہیں کہ اس وقفہ میں ان کو دہرانا ذرا بھی مشکل نہیں۔ اس لیے ﴿فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ﴾ میں اگر مسلمانوں کو خطاب بھی لیا جائے تو بھی سورۂ فاتحہ کے پڑھنے سے اس حکم کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔

(۲) دوسرے کل رکعتیں فرض نماز کی سترہ ہیں جن میں سے صرف چھ رکعتوں میں قراءت بالجہر ہوتی ہے اور باقی گیارہ میں خفیہ ہوتی ہے۔ تو گویا قریباً صرف ایک تہائی رکعات میں فاتحہ بلند آواز سے پڑھی جاتی ہے اور دو تہائی میں منہ میں پڑھی جاتی ہے۔ اب ان دو تہائی رکعات میں تو سنتا ہی نہیں۔ نہ اس پر فَاسْتَمِعُوْا کا حکم وارد ہوتا ہے۔ اور یہ کہنا کہ مقتدی کو علم ہے کہ امام کچھ پڑھ رہا ہے نہایت بودی بات ہے۔ اس علم سے آواز پیدا نہیں ہو جاتی۔ پس کل رکعتوں میں ایک حکم اگر لگایا جائے تو ترجیح اسی کو ہوگی جس کا تعلق زیادہ رکعات سے ہے اور زیادہ رکعات میں کوئی شے فاتحہ کے پڑھنے میں مانع نہیں۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ باقی قراءت مقتدی کیوں نہ پڑھے تو جواب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کا حکم ایسا نہیں۔ فاتحہ

وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّ خِيْفَةً وَّ دُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ وَ لَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ﴿۲۰۵﴾

اور اپنے رب کو اپنے دل میں یاد کرتا رہ عاجزی سے اور ڈرتے ہوئے اور ایسی آواز میں جو بہت بلند نہ ہو صبح وشام کے وقتوں میں اور غافلوں میں سے مت ہو۔ (1200)

پڑھنے کے لیے ہے۔ مگر باقی قراءت کے لیے نہیں۔ خود وہ لوگ جو فاتحہ خاموشی کی حالت میں بھی نہیں پڑھتے تسبیحات پڑھتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ ایسا حکم نبی کریم ﷺ جیسا حکیم انسان نہ دے سکتا تھا۔ کیونکہ فاتحہ کو تو ہر مقتدی جانتا ہے مگر باقی قراءت میں امام کا تتبع کرنا سو مقتدی میں سے ایک کے لیے بھی مشکل ہوتا اور لمبی آیات میں تو یہ ممکن ہی نہیں ہوتا۔ اس لیے فاتحہ اور باقی قراءت کا حکم ایک نہیں۔ فاتحہ ایک خاص دعا ہے جو ہر ایک رکعت میں لازماً پڑھی جاتی ہے باقی کسی حصہ قرآن کو یہ امتیاز حاصل نہیں۔

1200 - یہاں خطاب عام ہے جیسا کہ عمومیت حکم سے ظاہر ہے۔

﴿فِيْ نَفْسِكَ﴾ **دل میں ذکر کرنے سے کیا مراد ہے؟** آواز کا ذکر تو آگے آتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ یہاں مراد ایسا ذکر ہے جس میں انسان کا دل ذکر میں مصروف ہو یعنی الٰہی عظمت اور ہیبت اور جلال کا اثر دل پر ہو۔

خِيْفَةً۔ اصل خَوْفَةٌ ہے۔ تضرع بندہ کا عاجزی اختیار کرنا اور خوف عظمت الٰہی کا ہے۔

﴿دُوْنَ الْجَهْرِ﴾ عاجزی اور خوف کا یہ تقاضا ہے کہ انسان بہت شور نہ ڈالے۔ ﴿دُوْنَ الْجَهْرِ﴾ سے مراد یہ نہیں کہ آواز اونچی نہ ہو بلکہ یہ منشا ہے کہ زیادہ شور نہ ڈالے گویا آواز میں بھی اقتصاد ہو۔

غُدُوٌّ۔ قاموس میں اسے غُدْوَةٌ کی جمع لکھا ہے اور یا یہ مصدر ہے۔ صبح کا وقت۔ اور مفردات میں ہے کہ قرآن کریم میں غُدُوٌّ کے مقابل پر اٰصَالٌ آیا ہے۔ جیسے یہاں اور غَدَاةٌ کے مقابل پر عَشِيّ جیسے ﴿بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ﴾ [الأنعام: 52:6] ''صبح اور شام۔''

اٰصَالٌ۔ اَصَلٌ یا اَصِيْلٌ کی جمع ہے عصر اور غروب کے درمیان کا وقت ہے۔ مراد مطلق شام ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ کے ذکر کا حکم ہے اور وہ دو رنگ میں ہے۔ ایک دل میں اور ایک آواز کے ساتھ جو وہ بھی ﴿دُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ﴾ ہو۔ پس اصل مطلب یہ ہے کہ جب نماز میں یا ویسے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو اور سب سے بڑھ کر ذکر اللہ تعالیٰ کا نماز میں ہی ہے۔ تو ایسا نہ ہو کہ منہ سے کلمات نکلتے ہوں مگر دل اور کہیں ہو۔ اس لیے فرمایا کہ زبان سے ذکر ہو تو دل میں بھی وہی کیفیت ہو اور دل عظمت الٰہی اور ہیبت اور جلال سے بھرا ہوا ہو تا کہ ذکر کا اصل مقصد پورا ہو۔ اور ﴿بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ﴾ میں نماز کے

اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ يُسَبِّحُوْنَهٗ وَ لَهٗ يَسْجُدُوْنَ ۩ ۲۰۶

جو تیرے رب کے پاس ہیں اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے اور اس کی تسبیح کرتے ہیں اور اس کے آگے سجدہ کرتے ہیں۔ (1201)

ع 24 18 14

اوقات بھی آجاتے ہیں۔یعنی ایک طرف فجر کا وقت، دوسری طرف ظہر سے لے کر عشاء تک کا وقت۔

1201 - ﴿عِنْدَ رَبِّكَ﴾ میں سب مقربین بارگاہ الٰہی داخل ہیں۔

ترتیب قرآن کریم میں یہاں سجدۂ تلاوت پہلی دفعہ آتا ہے۔سجدۂ تلاوت قرآن کریم کی تلاوت میں خاص خاص موقعوں پر نبی کریم ﷺ کا حکم ہے خواہ وہاں سجدہ کا حکم ہو یا اور کسی رنگ میں سجدہ کا ذکر ہو۔سجدۂ تلاوت میں آنحضرت ﷺ سے **مختلف** دعائیں مروی ہیں۔مثلاً ایک یہ [اَللّٰهُمَّ لَكَ سَجَدَ سَوَادِي، وَبِكَ آمَنَ فُؤَادِي، اَللّٰهُمَّ اُرْزُقْنِي عِلْمًا يَنْفَعُنِيَ، وَعَمَلًا يَّرْفَعُنِي] (مصنف ابن أبي شيبة، جلد2، صفحہ20، حديث:4406) اور ایک حدیث میں آپ کی یہ دعا آتی ہے: [سَجَدَ وَجْهِيَ لِلَّذِي خَلَقَهٗ وَشَقَّ سَمْعَهٗ وَبَصَرَهٗ بِحَوْلِهٖ وَقُوَّتِهٖ فتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِينَ] (سنن ابن ماجه، جلد1، صفحہ335، حديث: 1054) سجدۂ تلاوت ایک شہادت ہے کہ مسلمان کو یا قرآن پر ایمان لانے والے کو تعمیل حکم الٰہی میں کس قدر جلدی کرنی چاہیے۔

سورۃ الانفال

نام:

اس سورت کا نام الْاَنْفَالِ ہے اور اس میں 10 رکوع اور 75 آیات ہیں۔ الْاَنْفَالِ کے معنی مال غنیمت یا وہ مال جو با قاعدہ جنگ میں دشمن سے ہاتھ آتا ہے۔ اس سورت میں اصل ذکر جنگ بدر کا ہے اور یہ سب سے پہلی با قاعدہ جنگ ہے جو مسلمانوں اور کفار میں ہوئی اور اس میں دشمن سے مال غنیمت ہاتھ میں آیا اور قیدی بھی پکڑے گئے، ایسے مال کو جائز قرار دیا ہے۔ دوسری طرف ایک تجارتی قافلہ انہی قریش کا جا رہا تھا اور مسلمانوں میں سے بعض لوگوں کا خیال تھا کہ اس قافلہ پر حملہ کر کے لوٹ لیا جائے۔ اس کو قرآن شریف نے ﴿عَرَضَ الدُّنْیَا﴾ یعنی دنیا کا مال قرار دے کر ناجائز قرار دیا تو گویا بتانا یہ مقصود تھا کہ جنگ میں جو مال دشمن سے ملے وہ جائز ہے لیکن مال کا حاصل کرنا اصل غرض نہیں بلکہ جنگ کی اصل غرض کچھ اور ہے۔ اس لحاظ سے سورت کا نام الْاَنْفَالِ قرار دیا۔

خلاصہ مضمون:

اس سورت کا اصل مضمون جنگ بدر اور اس کے متعلقہ واقعات ہیں۔

① اس لیے پہلی ہی آیت میں انفال یا مال غنیمت کا ذکر کیا ہے۔ مگر اس بات کو ظاہر کرنے کے لیے کہ اصل غرض جنگ یا جنگوں کے ذریعہ سے حصول مال نہیں فوراً اس طرف توجہ دلائی ہے کہ آپس میں اصلاح کرو اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرو۔ اللہ کا ذکر کرو، نمازیں قائم کرو، زکوٰۃ دو تو پکے مومن بنتے ہو۔ اور پھر اصل مضمون جنگ بدر کی طرف عود کیا اور بتایا کہ جنگ بدر میں اللہ تعالیٰ احقاق حق کرنا چاہتا تھا اور یہ کہ دشمن جو اسلام کو نیست و نابود کرنا چاہتے ہیں ان کا استیصال کر دے۔

② دوسرے رکوع میں جنگ بدر میں فتح کا اور ان اسباب کا جن سے فتح ہوئی ذکر ہے اور وہ محض اللہ تعالیٰ کی نصرت تھی۔

③ تیسرے میں پھر بتایا کہ فلاح کی حقیقی راہیں کیا ہیں اور مسلمانوں کو تنبیہ فرمائی۔

④ چوتھے میں فرمایا کہ جنگ بدر کے بعد بھی کفار لڑائی میں نکلتے رہیں گے۔ مگر آخر کار مغلوب ہوں گے اور مسلمان خانہ کعبہ کے متولی ہمیشہ کے لیے قرار دیئے جائیں گے۔

⑤ پانچویں میں بتایا کہ اجتماع بدر مصلحت الٰہی سے ہوا اور نہ مسلمانوں میں اتنی طاقت تھی کہ اتنی بڑی جمعیت سے مقابلہ کے لیے نکلتے۔

⑥ چھٹے میں مسلمانوں کو جنگ میں ثابت قدم رہنے کی نصیحت کی تا کہ نصرت الٰہی کے جاذب بنیں۔

⑦ ساتویں میں کفار کی بدعہدیوں کا ذکر کیا۔

⑧ آٹھویں میں بتایا کہ دشمن کے مقابلہ کے لیے ہر وقت تیار اور مستعد رہنا چاہیے۔

⑨ نویں میں تسلی دی کہ کفار کی زیادتی تعداد سے نہ گھبرائیں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو دگنی اور دس گنی تعداد پر بھی غالب کر دکھائے گا اور اسی میں آخر پر بتا دیا کہ قیدی یا مال غنیمت باقاعدہ جنگ کی صورت میں لیے جا سکتے ہیں۔

⑩ دسویں میں مسلمانوں کے باہمی تعلقات قومی بتائے اور فرمایا کہ دین کے معاملہ میں اگر کفار مسلمانوں پر زیادتی کریں تو دوسرے مسلمانوں کا فرض ہے کہ ان کی مدد کریں سوائے اس صورت کے کہ ایسی کافر قوم سے مسلمانوں کا عہد ہو۔

تعلق:

اس سے پہلے سورۂ اعراف میں ضرورت نبوت پر بحث کرتے ہوئے بتایا تھا کہ گزشتہ امتیں جنہوں نے نہ صرف حق کو رد کیا بلکہ خود حق کا استیصال کرنا چاہا ان کا انجام کیا ہوا اور اس سورت کے آخر پر بتایا تھا کہ آنحضرت ﷺ کے اعدا کو بھی ہم تدریجاً پکڑیں گے۔ اس تدریجی گرفت میں سب سے پہلے جنگ بدر کا مقام ہے جس میں کفار کے لیے ایک عبرت آموز سبق تھا اور آنحضرت ﷺ کی صداقت کی ایک یقینی دلیل تھی کیونکہ مسلمانوں کے باوجود قلت کے غالب آنے کی پیشگوئیاں مدت پہلے قرآن شریف میں مکہ میں ہو چکی تھیں۔ اس لیے سورۂ اعراف کے مضمون کا تقاضا تھا کہ اس کے بعد فوراً جنگ بدر کا ذکر ہوتا جو آنحضرت ﷺ کے مخالفین کی تدریجی گرفت میں پہلی منزل تھی۔

زمانۂ نزول:

اس سورت کی تاریخ نزول جنگ بدر کا ہی زمانہ ہے یعنی دوسرا سال ہجرت۔ بعض آیات جن میں کفار کی بار بار عہد شکنی کا ذکر ہے بعد کے زمانہ کی معلوم ہوتی ہیں اور وہ آیات جن میں آنحضرت ﷺ کے خلاف کفار مکہ کے منصوبوں کا ذکر ہے یعنی ہجرت سے پہلے کے واقعات کا وہ درحقیقت مکی نہیں ہیں بلکہ مسلمانوں کو گزشتہ واقعات کا حوالہ دے کر یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ اس وقت بھی اسلام کی تائید میں تھا جب آنحضرت ﷺ اکیلے دشمنوں کے اندر رہ گئے تھے اور وہ دشمن آپ کے قتل کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے اور یوں ان کو تسلی دی ہے کہ وہ اسلام کی ہمیشہ تائید فرماتا رہے گا۔

آیاتُها 75 (8) سُوْرَةُ الْاَنْفَالِ مَدَنِيَّةٌ (88) رُکُوْعَاتُها 10

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۪ وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ①

تجھ سے مالِ غنیمت کے متعلق سوال کرتے ہیں۔کہہ مال غنیمت اللہ اور رسول کا ہے سو اللہ کا تقویٰ کرو اور اپنے اندر کے معاملات کو سنوارو اور اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو اگر تم مومن ہو۔(1202)

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَ جِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ اِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ

مومن وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب ان پر اس کی آیتیں پڑھی

1202- **غنیمت اور انفال میں فرق:** اَلْاَنْفَال۔نَفَلٌ کی جمع ہے جو اصل میں زیادت ہے یعنی جس قدر واجب ہو جو اس سے زیادہ ہو وہ نفل ہے۔اسی معنی میں نفل عبادت ہے اسی لیے مال غنیمت کو نَفَلٌ کہا جاتا ہے۔مگر اس میں اختلاف ہوا ہے کہ کس قسم کی غنیمت پر یہ لفظ بولا گیا ہے؟ بعض نے اسے عین غنیمت کہا ہے۔یعنی انفال اور غنیمت ایک ہی شے ہے۔دو نام دو حیثیتوں سے رکھے گئے ہیں۔اس لحاظ سے کہ وہ مال مظفر ہو کر ملتا ہے اسے غنیمت کہا جاتا ہے اور اس لحاظ سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک فضل ہے **اسے انفال کہا جاتا ہے**۔اور بعض نے غنیمت اور نفل میں عموم و خصوص کے لحاظ سے فرق کیا ہے۔یعنی غنیمت عام ہے محنت سے حاصل ہو یا بلا محنت، فتح سے پہلے حاصل ہو یا پیچھے، اور نفل وہ ہے جو مال غنیمت میں سے تقسیم سے پہلے حاصل ہو یا وہ جو بغیر جنگ کے حاصل ہو مگر **ایسے مال کو فئے کہا جاتا ہے**۔گو فئے کے لیے ضروری ہے کہ جنگ کی تیاری ہو چکی ہو اور دشمن نے ہتھیار ڈال دیئے ہوں۔نفل کے لیے یہ ضروری نہیں۔

﴿لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ﴾ سے مراد بیت المال ہے یعنی مسلمانوں کی عام اور مشترکہ ضروریات۔

اس سورت میں بالخصوص جنگ بدر کا ذکر ہے اور اس کا تعلق سورت ماقبل سے یوں ہے کہ وہاں انبیائے سابق کے مخالفوں کی ہلاکت کا ذکر ہے یہاں آنحضرت ﷺ کے اعدا کی ہلاکت اور ان پر جو عذاب آیا اس کا ذکر ہے۔اس لیے اس کی ابتدا اس سے ہوتی ہے کہ جنگ میں جو بعض قسم کا مال دشمن سے حاصل ہوتا ہے اس کو کس غرض پر صرف کیا جائے؟ اور اس کے متعلق یہ حکم دیا ہے کہ وہ مسلمانوں کی عام ضروریات پر خرچ ہو۔لیکن یہ سمجھانے کے لیے کہ جنگ اصل ضروریات میں سے نہیں بلکہ محض ایک اتفاقی پیش آمدہ امر ہے۔جنگ کے ذکر کو چھوڑ کر فوراً اس طرف توجہ دلائی کہ متقی با اخلاق انسان بنو اور آپس میں صلح کرو۔

اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۚ﴿۲﴾

جائیں وہ اُن کو ایمان میں بڑھاتی ہیں اور وہ اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ (1203)

الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ؕ﴿۳﴾

جو نماز کو قائم کرتے ہیں اور اس سے جو ہم نے ان کو دیا ہے خرچ کرتے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ مَغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ ۚ﴿۴﴾

یہی سچے مومن ہیں ان کے لیے ان کے رب کے ہاں (بڑے) درجے اور حفاظت اور عزت والا رزق ہے۔ (1204)

كَمَاۤ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ۪ وَ اِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۙ﴿۵﴾

جس طرح تیرے رب نے تجھے تیرے گھر سے حق کے ساتھ نکالا اور مومنوں میں سے ایک گروہ ناخوش تھا۔ (1205)

1203 - وَجِلَ۔ اِسْتِشْعَارٌ خوف کا نام ہے یعنی محسوس کرنا۔ (غ) ﴿اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ﴾ [الحجر: 52:15] ''ہم تم سے ڈرتے ہیں۔'' ﴿وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ﴾ [المؤمنون: 60:23] ''حالانکہ ان کے دل خوف سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔''

﴿زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا﴾ اس سے معلوم ہوا کہ **ایمان کم وبیش بھی ہوتا رہتا ہے**۔ گویا برے اعمال سے اس میں نقص واقع ہوتا ہے اور اچھے اعمال سے ایمان بڑھتا ہے۔ بخاری میں حدیث مروی ہے کہ **ایمان کی ساٹھ سے اوپر شاخیں ہیں**۔ جن میں سے لا الہ الا اللہ سب سے بلند اور رستہ سے دکھ دینے والی چیزوں کو دور کرنا سب سے نچلی شاخ ہے اور حیا بھی ایمان کی ایک شاخ ہے۔ آج مسلمانوں کا دعویٰ ایمان اور عملی حالت ان آیات اور احادیث کی تکذیب کر رہے ہیں۔

1204 - ان تین آیات میں مومنوں کی صفات کو بیان کیا ہے تاکہ زندگی کے اصل مقصد کو سمجھ لیں۔ مسلمانوں کی تیاری جنگ کے لیے اس طرح پر نہیں ہوئی کہ انہیں فنون جنگ میں مہارت کا سبق سکھایا جاتا۔ بلکہ قیام نماز اور انفاق فی سبیل اللہ کا سبق ان کو پڑھا کر اور یہ بتا کر کہ دل میں خوف الٰہی ہونا چاہیے اور متکبرانہ روش سے بچنا چاہیے، ان کو جنگ کے لیے تیار کیا ہے۔ اسی سبق کا نتیجہ تھا کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جنگیں بے وجہ خونریزی سے پاک تھیں۔ اور بڑی بڑی فتوحات کے وقت دشمنوں کے ساتھ کمال عفو اور نرمی کا سلوک تھا اور مخلوق خدا کی ہمدردی مدنظر تھی۔

1205 - كَمَا میں اشارہ آیت ماقبل کے آخری الفاظ کی طرف ہے۔ یعنی مومن کا اصل کام تو وہی ہے جو ان آیات میں بیان ہوا یعنی دل میں عاجزی کا پیدا کرنا، نماز قائم کرنا، خدا کی راہ میں اپنی طاقتوں اور مال کا خرچ کرنا۔ اسی راہ پر چلنے سے بلند درجات اور

يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ — تیرے ساتھ حق کے بارے میں جھگڑتے ہیں اس کے بعد
كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ — کہ وہ واضح ہوگیا گویا کہ وہ موت کی طرف ہانکے جاتے ہیں

رزق کریم ملتا ہے۔ چنانچہ انہی درجات بلند اور رزق کریم کے دینے کے لیے ہی اللہ تعالیٰ نے تم کو تمہارے گھر سے حق کے ساتھ نکالا۔ یعنی جنگ بدر کے لیے مدینہ سے تم کو حق کے ساتھ نکالا بالفاظ دیگر اس وقت اللہ تعالیٰ نے تم کو نکلنے کا حکم دیا جب ضروریات حقہ پیش آ چکی تھیں۔

جنگ بدر جن حالات میں پیش آئی اس کے متعلق قرآن کریم سے بڑھ کر اور کوئی معتبر شہادت نہیں ہوسکتی اور ان آیات میں مختصر مگر جامع الفاظ میں جنگ بدر کے تمام ابتدائی مراحل کی شہادت ہمیں ملتی ہے۔ اس قدر تو مسلم ہے کہ جب نبی کریم ﷺ مدینہ سے نکلے ہیں اس وقت ایک طرف کفار کی ایک زبردست جمعیت ابوجہل کی کمانڈ کے ماتحت مکہ سے نکل چکی تھی بلکہ اس کی خبر بھی نبی کریم ﷺ کو پہنچ چکی تھی۔ کیونکہ مقام بدر جہاں مڈھ بھیڑ ہوتی ہے مکہ سے آٹھ یا نو منزل اور مدینہ سے تین منزل پر ہے۔ دوسری طرف یہ بھی درست ہے کہ ایک تجارتی قافلہ شام سے ابوسفیان کی سرکردگی میں مکہ کو واپس آ رہا تھا اور اس کی اطلاع بھی مسلمانوں کو تھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا رسول اللہ ﷺ اس قافلے کو لوٹنے کے لیے نکلے تھا یا اس لشکر کی مدافعت کے لیے۔ **ارباب سیر نے بعض غیر محتاط روایات سے یہ غلطی کھائی ہے کہ نبی کریم ﷺ ابوسفیان کے تجارتی قافلہ پر حملہ کرنے کے لیے گھر سے نکلے تھے**۔ حالانکہ حق یہ ہے کہ آپ ابوجہل کے لشکر کے مقابلہ کے لیے نکلے تھے جو مدینہ پر حملہ آور ہونے کے لیے مکہ سے نکلا تھا۔ اس امر پر کہ دوسری بات صحیح ہے پہلی شہادت الفاظ ﴿اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ﴾ سے ملتی ہے۔ ظاہر ہے کہ بیت تو مدینہ ہی ہے اور مدینہ سے آپ کے نکلنے کو اللہ تعالیٰ کے حکم کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ اپنی خواہش سے یا لوگوں کے مشورہ کی بنا پر نہیں نکلے بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے نکلے ہیں۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی قافلہ پر حملہ کرنے کا حکم دیا ہوگا تو یہ اس لیے غلط ٹھہرتا ہے کہ یہ واقع نہیں ہوا حالانکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا تو ضرور تھا کہ واقع ہو کر رہتا۔ **دوسری شہادت** بِالْحَقِّ سے ملتی ہے۔ کسی فعل یا قول کا حق ہونا یہ ہوتا ہے کہ جیسا کہ راغب نے لکھا ہے جب اس کا وقوع [بِحَسَبِ مَا يَجِبُ وَبِقَدَرِ مَا يَجِبُ وَفِي الْوَقْتِ الَّذِيْ يَجِبُ] ہو یعنی اس کے مطابق جو واجب ہو اور اس اندازہ سے جو واجب ہو اور اس وقت میں جو واجب ہو۔ اب اگر تجارتی قافلہ پر حملہ کے لیے نکالا ہوتا تو یہ تینوں لحاظ سے کسی طرح پر بالحق نہ تھا۔ اس لیے کہ اول تو کسی راہ چلتے قافلہ پر حملہ [بِحَسَبِ مَا يَجِبُ] نہیں اس کا واجب ہونا چھوڑ اس کی ضرورت ہی کوئی نہیں۔ اور پھر [بِقَدَرِ مَا يَجِبُ] بھی نہیں۔ اس لیے کہ آنحضرت ﷺ پوری تیاری کر کے نکلے ہیں جو ممکن تھی۔ حالانکہ قافلہ کے لیے پچاس مسلح آدمی ہی کافی تھی۔ اور فی الوقت [الَّذِيْ يَجِبُ] بھی نہیں اس لیے کہ قافلہ تو اس وقت بہت دور نکل چکا تھا۔ یہاں تک کہ جنگ بدر میں فتح حاصل کرنے کے بعد اتنا قریب بھی نہ تھا کہ اس پر حملہ کیا جاتا۔ پس اخراج بالحق اسی وقت ہوسکتا ہے کہ اس لشکر کے مقابلہ کے لیے نکلیں جو مدینہ پر مسلمانوں کو کچلنے کے لیے حملہ آور ہو رہا ہے۔ یہ ایک ضرورت حقہ تھی اور پھر تیاری بھی اسی کے مطابق کی گئی اور پھر وقت بھی اسی کے مقابلہ کا تھا۔ اور قافلہ پر حملہ کرنے کے لیے نکلنا اس لیے بھی بالحق نہیں کہلا سکتا کہ قرآن کریم میں حکم ہے

وَ هُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝ اور وہ دیکھ رہے ہیں۔ (1206)

وَ اِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَ تَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَ يَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۝

اور جب اللہ تمہیں دو گروہوں میں سے ایک کا وعدہ دیتا تھا کہ وہ تمہارے لیے ہے اور تم چاہتے تھے کہ جس کے پاس ہتھیار نہیں وہ تمہارے لیے ہو اور اللہ ارادہ کرتا تھا کہ اپنی پیشگوئیوں کے ذریعے سے حق کو ثابت کرے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔ (1207)

﴿وَ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ﴾ [البقرة: 190:2] ''اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں۔'' اور اس قافلہ نے آپ سے جنگ نہ کی تھی، نہ ابھی تک قریش نے ہی آپ پر حملہ کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بدر کے دن نبی کریم ﷺ پہلے کفار کے حملہ کے منتظر رہے اور جب انہوں نے حملہ کیا تب آپ نے مدافعت کا حکم دیا۔ تیسری قطعی شہادت اس بات پر کہ رسول اللہ ﷺ جب مدینہ سے نکلے تو مدینہ پر حملہ آور لشکر کے مقابلہ کے لیے نکلے ان الفاظ سے ملتی ہے کہ آپ جب مدینہ سے نکلے تو اس وقت مومنوں کا ایک حصہ ناخوش تھا۔ اس ناخوشی کی وجوہات اگلی آیت میں بتائی ہیں۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ اگر قافلہ پر حملہ کا مطلب ہوتا تو کوئی فریق ناخوش کیوں ہوتا اور اس کو مصیبت کیوں سمجھتا۔ تین سو چھوڑ پچاس آدمی بھی ایک قافلہ کو لوٹنے کے لیے کافی تھے۔ پس مدینہ سے نکلتے وقت مومنوں کی ایک جماعت کی ناخوشی صاف بتاتی ہے کہ وہ مدینہ پر حملہ آور لشکر کے مقابلہ کے لیے نکل رہے تھے۔

1206 - چوتھی شہادت اس بات کی ﴿فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ﴾ میں موجود ہے کیونکہ نکلنے کو ناپسند کرنے والے اسے ضرورت حقہ نہیں سمجھتے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وہ ضرورت ظاہر ہو چکی تھی۔ ضرورت ظاہر اس صورت میں کہلا سکتی ہے جب مسلمانوں کی ہستی معرض خطر میں ہو اور دشمن حملہ آور ہو چکا ہو۔ کیونکہ جنگ کی اجازت ہی انہی لوگوں سے تھی جو پہلے جنگ کریں۔ جیسا ﴿اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ﴾ [الحج: 39:22] ''ان لوگوں کو اجازت دی گئی ہے جن سے لڑائی کی جاتی ہے۔'' سے۔ اور پھر ﴿وَ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ﴾ [البقرة: 190:2] ''اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں۔'' سے ظاہر ہے۔ قافلہ تو مسلمانوں سے جنگ کرنے نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ جنگ کی ضرورت کو الفاظ قرآنی میں واضح اور بین کہا جا سکے۔ پانچویں اور نہایت کھلی ہوئی شہادت الفاظ ﴿كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ﴾ سے ملتی ہے۔ قافلہ پر حملہ کرنے کے لیے نکلنے کو کون موت کے منہ میں جانا کہہ سکتا ہے۔ ہاں وہ طاقتور لشکر جو مدینہ پر حملہ آور ہو رہا تھا اس سے مقابلہ کرنے کے لیے نکلنا واقعی موت کے منہ میں جانا تھا۔

1207 - ﴿غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ﴾۔ شَوْكَ اصل میں کانٹوں کو کہتے ہیں اور اس سے مراد شدت اور ہتھیار بھی لیے جاتے ہیں۔ (غ)

لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَ يُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝۸

تا کہ حق کو سچ اور باطل کو جھوٹا کر دے، گو مجرم ناپسند کریں۔

اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ ۝۹

جب تم اپنے رب سے فریاد کرتے تھے سو اس نے تمہاری پکار سنی کہ میں ایک ہزار آگے چلنے والے فرشتوں کے ساتھ تمہاری مدد کرنے والا ہوں۔ (1208)

يُّحِقَّ۔ اَحْقَاقٌ سے ہے یہاں مراد وہ احقاق حق ہے جو دلائل اور نشانات کے اظہار سے ہو۔

دو گروہوں کا ذکر اور خدائی ارادہ:

اس آیت میں جنگ بدر کی وجوہات کو اور بھی کھول دیا ہے۔ یہاں صاف بتا دیا کہ دو گروہ تھے، ایک مسلح اور ایک غیر مسلح۔ یعنی تجارتی قافلہ اور تم (یعنی مسلمانوں میں سے وہ لوگ جن کے خوف کا ذکر اوپر ہے۔) چاہتے تھے کہ غیر مسلح گروہ یعنی قافلہ کے ساتھ مقابلہ ہو اور اللہ تعالیٰ اس کے خلاف چاہتا تھا یعنی مسلح لشکر سے مقابلہ ہو۔ تو جس صورت میں گھر سے نکالنے والا اللہ تعالیٰ تھا یعنی نکلنا اس کے حکم سے تھا تو صاف معلوم ہوا کہ یہ نکلنا مسلح لشکر کے مقابلہ کے لیے تھا۔ یعنی ابوجہل کے مقابلہ کے لیے اور تجارتی قافلہ پر حملہ کرنے لیے نہ تھا جو محض بعض کمزور دلوں کی خواہش تھی۔ یہ چھٹی دلیل ہے جو ہمارے مدعا کو ثابت کرتی ہے۔ اور جن روایات میں قافلہ پر حملہ کو مدینے سے نکلنے کی وجہ بتایا گیا ہے وہ اسی بنا پر محمول ہو سکتی ہیں۔ ساتویں دلیل ان الفاظ میں ہے ﴿وَ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ﴾ یہ تو ظاہر ہے کہ کلمات سے مراد کوئی اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اب اللہ تعالیٰ کے کلام کو ایک جنگ سے کیا تعلق ہے۔ سوائے اس کے کہ اس جنگ کے متعلق کوئی پیشگوئیاں ہوں۔ چنانچہ قرآن کریم میں جنگ بدر کے متعلق اور مسلمانوں اور کافروں میں مقابلہ ہو کر مسلمانوں کے غالب آنے کے متعلق صریح پیشگوئیاں ہیں اور کلمات میں انہی پیشگوئیوں کی طرف اشارہ ہے۔ یوں یہ جنگ محض جنگ نہ تھی بلکہ ایک دلیل اور نہایت واضح دلیل اسلام کی صداقت کی تھی۔ لیکن قافلہ پر حملہ کرنے کی نہ کوئی پیشگوئی تھی نہ کوئی ایسی پیشگوئی پوری ہوئی۔ آٹھویں دلیل الفاظ ﴿يَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ﴾ میں ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا منشا تمہارے مدینہ سے نکالنے میں یہ تھا کہ کافروں کی جڑ کاٹ دے یعنی ان کی طاقت کو کچل دے۔ لیکن ظاہر ہے کہ کفار کی طاقت ایک قافلہ کو لوٹنے سے نہ کچلی جا سکتی تھی بلکہ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنا پورا زور لگا کر ہلاک ہوں۔

1208 - تَسْتَغِيْثُوْنَ۔ غَوْثٌ کا استعمال نصرت کے محل پر ہوتا ہے اور غَيْثٌ بارش ہے اور استغاثہ طلب غوث اور طلب غیث دونوں پر بولا جاتا ہے۔ (غ) یہاں طلب مدد ہی مراد ہے جیسا کہ سیاق سے ظاہر ہے اور دوسری جگہ ﴿فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِيْ مِنْ شِيْعَتِهٖ﴾ [القصص: 15:28] ''تو اس نے جو اس کی قوم سے تھا اس کے خلاف اس سے مدد مانگی۔'' ﴿وَ اِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ﴾ [الکھف: 29:18] ''اور اگر پانی مانگیں گے تو انہیں تلچھٹ جیسا پانی جیسا پانی دیا جائے گا۔''

وَ مَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَ لِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ ۚ وَ مَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۱۰ ع 1 10 15

اور اللہ نے اسے صرف ایک خوش خبری ٹھہرایا اور تا کہ اس کے ساتھ تمہارے دلوں کو اطمینان ہو اور مدد تو اللہ کی طرف سے ہی ہے۔ اللہ غالب حکمت والا ہے۔ (1209)

مُرْدِفِيْنَ ۔ ردف تابع یعنی پیچھے آنے والے یا پچھلے حصہ کو کہتے ہیں اور اَرْدَفْتُهٗ کے معنی ہیں اسے گھوڑے کے پچھلے حصہ پر (یعنی اپنے پیچھے) سوار کرلیا اور رَادِف پچھلے کو کہتے ہیں۔ اور مُرْدِف متقدم کو یعنی جس کے پیچھے دوسرا ہو۔ (غ) یعنی رَدِف اور اَرْدَف کے الگ الگ معنی ہیں جنہوں نے مردفین کے معنی پیچھے آنے والے کیے ہیں انہوں نے رَدِف اور اردَف کے ایک معنی کر لیے ہیں۔ رہا یہ کہ **آگے چلنے والے فرشتوں سے کیا مراد ہے؟** اور ان کے پیچھے کون ہے؟ سو ظاہر ہے کہ ملائکہ جیسا کہ آگے صراحت سے مذکور ہے مسلمانوں کو ثابت قدم کرتے اور کفار کے دل میں رعب ڈالتے تھے ﴿اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ﴾ [12] اس لیے وہ عسکر اسلامی کے لیے متقدم تھے یعنی وہ آگے تھے اور ان کے پیچھے لشکر اسلامی تھا۔ راغب نے یہ معنی نقل کیے ہیں [وَقِيْلَ الْمُرَادُ اَلْمُتَقَدِّمِيْنَ لِلْعَسْكَرِ يُلْقَوْنَ فِيْ قُلُوْبِ الْعِدَى الرُّعْبَ] ''یعنی عسکر اسلامی کے آگے جو فوج تھی ان کا رعب دشمن کے دل میں ڈال دیا۔''

یہ بھی اس وقت کا ذکر ہے جیسا کہ اِذْ کے استعمال سے ظاہر ہے جب نبی کریم ﷺ مدینہ سے نکلتے ہیں۔ مسلمان اپنی کمزوری دیکھ کر اور دشمن کی طاقت دیکھ کر اللہ تعالیٰ سے مدد چاہتے ہیں۔ اگر قافلہ پر حملہ کرنا مقصود ہوتا تو طلب مدد کا کوئی موقعہ نہ تھا۔ اور ظاہر ہے کہ جب ایک گروہ ڈر رہا ہے کہ ہمیں موت کے منہ میں دیا جاتا ہے وہی وقت طلب مدد کا ہے۔ پس یہ نویں دلیل اس بات پر ہے کہ مسلمان گھر سے لشکر کفار کے مقابلہ کے لیے نکلے تھے نہ کہ قافلہ پر حملہ کرنے کے لیے۔

ایک ہزار فرشتہ کی خصوصیت کیوں کی؟ ایک ہزار عدد کامل بھی ہے۔ مگر دوسری بات یہ بھی ہے کہ دشمن کی تعداد ایک ہزار کے قریب تھی اس لیے اسی قدر ملائکہ کی نصرت کا وعدہ دیا۔ [دیکھو نمبر: 511]

1209 - **ملائکہ کے ذریعہ نصرت** کا جو وعدہ دیا اس کے متعلق یہاں دو باتیں بیان فرمائیں۔ ایک یہ کہ تمہارے لیے یہ خوش خبری ہو کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ تین سو آدمی ایک ہزار کا مقابلہ کیا کر سکتے تھے۔ ملائکہ سے نصرت کا وعدہ دے کر فتح کی خوش خبری مسلمانوں کو دی اور بتایا کہ تمہاری تائید میں اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہے۔ یہ تو مسلمانوں کو پہلے سے خبر دی گئی تھی کہ کفار کے ساتھ ان کی جنگ ہوگی تو وہ مظفر و منصور ہوں گے اور کفار پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے ﴿سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَ يُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ۝﴾ [القمر: 45:54] ''کافروں کی جمعیت بھاگ جائے گی اور پیٹھ پھیر دیں گے۔'' یہاں یہ بھی بتایا ہے کہ وہ مدد کیوں کر ہوگی اس لیے ملائکہ کا ذکر فرمایا کیونکہ تین سو آدمی ایک ہزار پر غالب نہ آ سکتے تھے سوائے اس کے کہ کوئی اور اسباب ان کے موافق اور دشمن کے خلاف پیدا ہو جائیں۔ تو ملائکہ کی نصرت کے وعدہ میں یہ بتایا کہ وہ اسباب کوئی انسانی تجاویز کا نتیجہ نہیں بلکہ محض اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسباب پیدا ہوں گے۔ اور ملائکہ چونکہ وسائط ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کام لیتا ہے اس لیے ان وسائط کا ذکر کیا۔

اِذْ یُغَشِّیْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ وَ جب اس نے تم پر اپنی طرف سے امن کے لیے اُونگھ

دوسری بات یہ بیان فرمائی کہ تا تمہارے دلوں کو اس سے اطمینان ہو۔قلوب میں اطمینان کا پیدا کرنا بھی ملائکہ کا کام ہے اور یہ عام تجربہ ہے کہ وہی شخص جب اس کے قلب میں اطمینان ہو تو بہت بڑے بڑے کام کر سکتا ہے۔ حالانکہ اگر اس کا قلب اطمینان سے خالی ہو تو اس کے جسمانی قویٰ اور ظاہری سامان اس کو کچھ بھی نفع نہیں دیتے۔

تیسری غرض ﴿سَاُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ﴾[12] میں بیان فرمائی یعنی ملائکہ کے ذریعہ سے دشمنوں کے دل میں رعب ڈال دیا جائے گا اور یہ بھی صحیح ہے کہ مومن کتنے بھی ثابت قدم ہوتے لیکن اگر مقابلہ میں کفار بھی ثابت قدم ہوتے تو بھی مسلمانوں کو فتح نہ مل سکتی تھی۔اس لیے فرمایا کہ کافر مرعوب ہو جائیں گے اسی کی طرف ملائکہ کے لیے لفظ مردفین اختیار کرنے میں اشارہ ہے۔یعنی وہ مسلمان لشکر کے آگے آگے کفار کے دل میں رعب ڈالتے جائیں گے تا کہ کفار کے لشکر کے مسلمانوں کے سامنے قدم نہ جم سکیں۔

ان تین اغراض کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ صاف سمجھ آتا ہے کہ ملائکہ کا نزول ایک حقیقت تھی اور اسی نزول سے ہی مسلمانوں کے قلوب کو قوت ملی اور کفار کا لشکر مرعوب ہو گیا۔

ملائکہ نے بدر میں جنگ نہیں کی:

رہا یہ سوال کہ آیا ملائکہ نے انسانوں کی صورت میں ہو کر یا کسی اور طرح پر فی الواقع کفار سے لڑائی بھی کی یا نہیں۔اس بارہ میں مختلف رائیں ہیں۔ایک روایت میں ایک انصاری کا ذکر ہے کہ وہ ایک کافر کا تعاقب کر رہا تھا کہ اتنے میں اس نے ایک کوڑے کی آواز سنی اور وہ کافر گر گیا۔اور اس نے یہ ذکر رسول اللہ ﷺ سے کیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ ملائکہ کی امداد سے تھا اور ایک میں ہے کہ ابوجہل نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ یہ کیا بات تھی کہ ہم آواز سنتے تھے اور شکل نہ دیکھتے تھے۔تو انہوں نے کہا یہ ملائکہ تھے۔ان دونوں سے تو بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کو کسی نے دیکھا نہیں اور وہ جنگ کرتے تھے اور بعض لوگوں نے کہا کہ انہوں نے سفید کپڑے پہنے ہوئے انسانوں کی صورت میں لڑائی کی۔مگر قرآن کریم کی صراحت ان دونوں کے خلاف ہے اور اس آیت کے الفاظ قطعی ہیں۔ چنانچہ امام رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں:[وَالَّذِیْ یَدُلُّ عَلٰی صِحَّةِ أَنَّ الْمَلَائِكَةَ مَا نَزَلُوْا لِلْقِتَالِ قَوْلِهٖ تَعَالٰی وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰی... الخ]یعنی ''یہ آیت اس بات کی صحت پر دلالت کرتی ہے کہ بدر کے دن ملائکہ جنگ کرنے کے لیے نازل نہیں ہوئے۔'' اور اس کی تائید میں ایک روایت سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے جس میں یہ لفظ آتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے عریش میں دعا کے بعد سیدنا ابوبکر کو فرمایا: [اَبْشِرْ بِنَصْرِ اللّٰهِ وَلَقَدْ رَأَیْتُ فِیْ مَنَامِیْ جِبْرِیْلَ یَقْدُمُ الْخَیْلَ] (تفسیر الفخر الرازی، جلد1، صفحہ2128) یعنی ''اللہ کی مدد سے خوش ہو جاؤ میں نے اپنی خواب میں جبریل کو دیکھا کہ وہ لشکر کے آگے آگے چلتا ہے۔'' اور اس کے بعد امام رازی لکھتے ہیں اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزول کی غرض صرف یہی بشارت تھی اور اس سے ان کے جنگ پر اقدام

يُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَ يُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَ لِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَ

ڈال دی(1210) اور اس نے تم پر بادل سے پانی اتارا تاکہ اس سے تم کو پاک کرے اور تم سے شیطان کی ناپاکی کو دور کردے اور تاکہ تمہارے دلوں کو قوت دے

کرنے کی نفی ہوتی ہے۔ اسی طرح روح المعانی میں اس آیت کے نیچے ہے: [فِي الْآيَةِ إِشْعَارَ بِأَنَّ الْمَلَائِكَةَ لَمْ يُبَاشِرُوْا قِتَالًا وَهُوَ مَذْهَبُ لِبَعْضِهِمْ] ''اور اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں نے لڑائی نہیں کی اور یہ بعض کا مذہب ہے۔''

نوٹ [نمبر: 512] سے ظاہر ہے کہ اس بات پر قریباً اتفاق ہے کہ سوائے بدر کے اور کسی جنگ میں ملائکہ نے لڑائی نہیں کی اور جنگ بدر میں نہ لڑنا خود اوپر کی بحث سے ظاہر ہے اور اگر ادنیٰ تدبر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جب تین جنگوں میں ملائکہ کے نزول کا ذکر ہے اور دو کے متعلق اتفاق ہے کہ فرشتے لڑے نہیں تو جس غرض کے لیے دو میں نزول ملائکہ ہوا اسی غرض کے لیے تیسری میں بھی ہوا، اس لیے جنگ بدر کو مستثنیٰ کرنا غلطی ہے۔ علاوہ ازیں خود قرآن کریم نے اس کا فیصلہ کیا ہے ﴿فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا﴾ [الأحزاب: 9:33] ہم نے ان پر ہوا بھیجی اور ایسے لشکر جنہیں تم نے نہیں دیکھا۔ یہ جنگ احزاب کے متعلق ہے۔ جہاں فرشتوں کو ایسے لشکر قرار دیا ہے جنہیں مسلمانوں نے نہیں دیکھا اور یہ قطعی شہادت اس بات پر ہے کہ فرشتوں کی امداد اور رنگ کی تھی۔ ان کا آنا یوں نہ تھا کہ تین سو مسلمانوں کے ساتھ ایک ہزار فرشتے مل کر تیرہ سو جنگ کرنے والے ہو گئے ہوں۔ ہاں تین سو کا ہزار پر غالب آنا یقینی شہادت ہے کہ مسلمانوں کو امداد غیبی پہنچی۔

1210 - نُعَاس۔ تھوڑی نیند یا اونگھ کو کہتے ہیں مگر راغب نے یہاں نُعاس کے معنی سکون بھی قبول کیے ہیں۔ کیونکہ نیند خود بھی سکون ہے۔

جنگ بدر کے ابتدائی مراحل کو بیان کر کے اب میدان جنگ کی کسی قدر کیفیت بیان کی اور اس میں سب سے پہلے یہ بتایا کہ ہم نے تم پر نُعَاس وارد کر دی۔ نُعَاس کے عام معنی اونگھ یا نیند کی مقاربت ہیں مگر کسی حدیث صحیح سے یہ ثابت نہیں کہ بدر کے دن لڑائی کے وقت مسلمانوں پر نیند وارد ہوئی تھی۔ البتہ اُحد کے دن خاتمۂ جنگ پر نیند کا وارد ہونا ایک مشہور واقعہ ہے۔ ہاں ایک صورت ہو سکتی ہے کہ رات کے وقت نیند کا آنا مراد لیا جائے۔ کیونکہ جنگ اگلے دن صبح شروع ہوئی۔ پس یہاں یا تو یہ مراد ہے کہ رات کو میدان جنگ میں تمہیں نیند آ گئی اور یہ امن کی نشانی تھی یعنی مسلمانوں کے دلوں میں جو دشمن کا خوف تھا وہ جاتا رہا اور مجاہد سے مروی ہے کہ بارش نُعَاس سے پہلے آئی تھی۔ (ث) اور یہ اس معنی کا موید ہے مگر رات کی نیند کے لیے نوم کا لفظ زیادہ موزوں تھا اور یا نُعَاس سے مراد یہاں سکون ہے اور مراد یہ ہے کہ وہ جو حالت خوف تھی کہ بعض سمجھتے تھے کہ ہم موت کے منہ میں جا رہے ہیں میدان جنگ میں پہنچ کر اللہ تعالیٰ نے اس کیفیت کو بدل کر دلوں میں سکون وارد کر دیا اور شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ نبی کریم ﷺ بہت دعا کرتے کرتے آخر عریش سے باہر تشریف لائے تو آپ کی زبان مبارک پر یہ لفظ تھے ﴿سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَ يُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ۝﴾ [القمر: 45:54] یعنی ''کافروں کی جمعیت بھاگ جائے گی اور پیٹھ پھیر دیں گے۔'' جو ایک قرآنی

يُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ ﴿۱۱﴾

اور قدموں کو اس کے ساتھ مضبوط کرے۔ (1211)

اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَ اضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ﴿۱۲﴾

جب تیرا رب فرشتوں کو وحی کرتا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں سو جو ایمان لائے ان کو ثابت قدم رکھوں۔ میں ان کے دلوں میں جو کافر ہوئے رعب ڈال دوں گا۔ سو گردنوں کے اوپر مارو اور ان کے پوروں کو کاٹ ڈالو۔ (1212)

پیشگوئی جنگ بدر کے لیے تھی۔

1211 - ﴿لِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ﴾۔ رَبَطَ کے معنی باندھنا ہیں اور دلوں پر ربط سے مراد وہی ہے جو سکینت کے نازل کرنے اور روح القدس سے تائید کرنے سے۔ (غ)

دوسری نعمت مسلمانوں پر یہ بیان کی ہے کہ **اللہ تعالیٰ نے مینہ برسادیا** اور اس مینہ سے کئی ایک فوائد حاصل ہوئے۔

اول یہ کہ جہاں مسلمان اترے تھے وہاں پانی کافی نہ تھا، دوسرے مسلمانوں کے اترنے کی جگہ نشیب میں تھی اور ریتلی زمین تھی جس میں پاؤں دھنستا تھا۔ پس بارش سے ایک تو پانی استعمال کے لیے یعنی وضو غسل کے لیے باافراط ہوگیا۔ اور دوسرے زمین سخت ہوگئی اور اس پر قدم جمنے لگا اور تطہیر سے مراد یا تو وضو غسل وغیرہ ہی ہیں اور یا دلوں سے کمزور خیالات کا دور کرنا۔ شیطان کی ناپاکی دور کرنے سے یا تو ان وساوس کا دور کرنا مراد ہے جو شیطان بعض دلوں میں ڈالتا تھا کہ ایک تو تم پہلے ہی کمزور تھے دوسرے جگہ بھی اچھی نہیں ملی اور یا پیاس کا دور کرنا مراد ہے، کیونکہ پیاس کو [شَيْطَانُ الْفَلَا] کہا جاتا ہے اور دلوں کی قوت اور قدموں کی مضبوطی اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ قدموں کی مضبوطی صرف یہی نہیں کہ ریتلی زمین پر بارش کی وجہ سے پاؤں جمنے لگا بلکہ یہ کہ دشمن کے مقابلہ پر قدم مضبوط ہوگئے۔

1212 - یہ میدان جنگ کا دوسرا نظارہ ہے۔ پہلا نظارہ وہ ہے جس کا ذکر پہلی آیت میں ہے اور یہاں عین حالت جنگ کا نقشہ کھینچا ہے۔ ملائکہ کا جو کام تھا اس کی تصریح یہاں خود قرآن کریم نے فرمادی ہے۔ اس لیے اختلاف روایات کے اندر صحیح راہ قرآن کریم کے الفاظ کو مدنظر رکھنا ہے۔ ملائکہ کو حکم تھا کہ مسلمانوں کو ثابت قدم رکھیں اور ملائکہ کا تعلق چونکہ قلوب سے ہوتا ہے اس لیے ان کا ثابت قدم رکھنا اسی طرح پر تھا۔ جیسا کہ زجاج نے بھی لکھا ہے کہ ان کے دلوں میں ایسا القا کریں جس سے ان کا عزم پختہ ہو اور ان کی کوششیں مضبوط ہوں۔ ﴿سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ﴾ والا فقرہ الگ ہے۔ جس میں مسلمانوں کو خطاب ہے کہ تم کفار کو مارو یہ ملائکہ کی وحی میں داخل نہیں۔ ﴿فَوْقَ الْاَعْنَاقِ﴾ سے مراد بعض نے سر لیے ہیں کہ ان کے سر کاٹ دو اور بعض نے فَوْقَ بمعنی عَلٰی

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ۚ وَ مَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۳﴾

یہ اس لیے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی اور جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتا ہے تو اللہ (بدی کی) سخت سزا دینے والا ہے۔[1213]

ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَ اَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۴﴾

اس (عذاب) کا مزہ چکھ لو اور (جان لو) کہ کافروں کے لیے آگ کا عذاب ہے۔[1214]

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ﴿۱۵﴾ ۚ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم ان سے جو کافر ہیں جنگ کی حالت میں ملو تو ان سے پیٹھ نہ پھیرو۔[1215]

لیا ہے یعنی ان کی گردنوں پر تلواریں مارو۔

بَنَانٍ۔ بَنَانَةٌ کی جمع ہے۔ انگلیوں کی پوروں کو کہتے ہیں۔ کیونکہ انہی سے ہاتھ کام دیتا ہے اور اسی میں انسان کی ساری قوت مخفی ہے۔ پس مراد یہ ہے کہ جن ہاتھوں سے تم پر تلواریں اٹھاتے ہیں ان ہاتھوں کو کاٹ ڈالو۔

1213 - شَآقُّوا۔ شَقّ کے معنی شگاف ہیں ﴿ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ﴿۲۶﴾﴾ [عبس: 26:80] ''پھر ہم زمین کو شق کرتے ہوئے پھاڑتے ہیں۔'' اور شِق کے معنی مشقت ہیں ﴿اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ﴾ [النحل: 7:16] ''سوائے جانوں کو مشقت میں ڈالنے کے۔'' اور شُقَّة وہ جانب ہے جس تک پہنچنے میں مشقت ہو ﴿بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ﴾ [التوبة: 42:9] ''مشقت کا سفر انہیں بہت دور معلوم ہوا۔'' اور شِقَاق مخالفت ہے ﴿وَ اِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا﴾ [النسآء: 35:4] ''اور اگر تم کو دونوں (میاں بیوی) میں باہم دشمنی کا ڈر ہو۔'' ﴿وَ مَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ﴾ [النسآء: 115:4] ''اور جو شخص رسول کی مخالفت کرے۔''

1214 - یہاں صاف طور پر اس عذاب دنیا کو عذاب آخرت کے لیے پیش خیمہ بتایا ہے۔ یہ اس لیے کہ دونوں قسم کے عذاب کا ان سے وعدہ کیا تھا ﴿وَ لَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ﴾ [السجدة: 21:32] ''اور ضرور ہم انہیں نزدیک کا عذاب بڑے عذاب سے پہلے چکھائیں گے۔'' سو اس پہلے عذاب کا آجانا ثبوت تھا کہ دوسرا وعدہ بھی سچا ہے۔

1215 - زَحْفٌ۔ اصل میں پاؤں گھسیٹ کر چلنا ہے۔ جس طرح بچہ چلتا ہے اور لشکر کے کوچ پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اس لیے کہ کثرت سامان وغیرہ کی وجہ سے وہ آہستہ آہستہ حرکت کرتا ہے۔ (غ) اس لیے زَحْفٌ کے معنی جنگ میں دشمن سے مڈھ بھیڑ بھی آئے ہیں۔ جیسے حدیث میں ہے: [وَإِنْ فَرَّ مِنَ الزَّحْفِ] (المعجم الاوسط، جلد4، صفحہ364، حدیث: 7738)۔

جنگ کے ذکر میں بتایا ہے کہ مسلمان کا یہ کام نہیں کہ دشمن کو پیٹھ دکھائے استثنا کا ذکر اگلی آیت میں ہے۔ چونکہ مسلمان کے لیے

وَ مَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ مَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۱۶

اور جو کوئی اس دن اُن سے اپنی پیٹھ پھیرے سوائے اس کے کہ جنگ کے لیے ایک طرف پھر جائے یا کسی جماعت کے ساتھ پناہ لے تو وہ اللہ کی ناراضگی لے پھرا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بری جگہ ہے۔ (1216)

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۪ وَ مَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ وَ لِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۱۷

سو تم نے ان کو نہیں مارا بلکہ اللہ نے ان کو مارا۔ اور جب تو نے پھینکا تو تُو نے نہیں پھینکا بلکہ اللہ نے پھینکا۔ اور تا کہ وہ مومنوں کو اپنی طرف سے اچھا انعام دے۔ اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ (1217)

جنگ کے قوانین بھی منجانب اللہ ہیں۔ اس لیے آج تک مسلمان ان احکام پر عامل ہیں۔ ترکوں کے متعلق بالخصوص یہ ایک مشہور امر ہے کہ گولی کا زخم ان کے سینہ پر یا سامنے کی طرف ہوتا ہے پیٹھ پر نہیں۔

1216- مُتَحَرِّفًا۔ حرف سے ہے جس کے معنی کنارہ یا طرف ہیں۔ پس تحرف کنارہ کشی ہے۔

مُتَحَيِّزًا۔ حَوْزٌ اس کا اصل ہے ایک چیز کا دوسری چیز کے ساتھ جمع ہونا۔ پس مُتَحَيِّزًا کے معنی ہیں [صَآئِرَ اِلٰى حَيْزٍ] (غ) جنگ میں دشمن کے سامنے دو حال میں بھاگنا جائز ہے۔ اول اغراض جنگ کے لیے، دوسرا بڑے حصہ لشکر سے کٹ جائے تو اس کے ساتھ ملنے کے لیے۔

1217- یہاں دو باتوں کا ذکر ہے۔ ایک مسلمانوں کا کفار کو قتل کرنا، دوسرے نبی کریم ﷺ کا رمی یعنی پھینکنا۔ حنین کے دن نبی کریم ﷺ کی رمی مسلم ہے۔ مگر بدر کے دن بھی بعض احادیث میں رمی کا ذکر ہے۔ گو طبی نے اس کے صحیح احادیث میں ہونے سے انکار کیا ہے اور وہ رمی یہ تھی کہ آنحضرت ﷺ نے ایک مٹھی کنکروں کی دشمن کے لشکر کی طرف پھینکی جو اس کی ہزیمت کا موجب ہوگئی۔ ان دونوں باتوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ اس سبب سے کہ دونوں میں ایک اعجازی رنگ ہے۔ تین سو مسلمان ہزار کے ساتھ مقابلہ کر کے ان کو کس طرح قتل کر سکتے تھے؟ ایک مٹھی کنکروں کی دشمن کو کس طرح بھگا سکتی تھی۔ دونوں میں اللہ تعالیٰ نے اعجازی رنگ پیدا کر دیا۔ اللہ کے قتل اور رمی سے مراد یہی ہے کہ ان میں اعجازی طاقت پیدا کر دی۔

ذٰلِكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۸﴾

یہ (تو ہو چکا) اور جان لو کہ اللہ کافروں کی جنگ کو کمزور کرنے والا ہے۔(1218)

اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ وَ اِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَ اِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ ۚ وَ لَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْـًٔا وَّ لَوْ كَثُرَتْ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹﴾ ع 2/9/16

اگر تم فیصلہ چاہتے تھے تو فیصلہ تمہارے پاس آ گیا(1219) اور اگر تم رک جاؤ تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اور اگر تم پھر (جنگ) کرو گے ہم بھی پھر (سزا) دیں گے اور تمہارا جتھا تمہارے کچھ کام نہ آئے گا اگر چہ بہت ہوں اور (جان لو) کہ اللہ مومنوں کے ساتھ ہے۔(1220)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَ اَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ﴿۲۰﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو اور اس سے مت پھرو در آنحالیکہ تم سنتے ہو۔(1221)

1218- ذٰلِكُمْ میں اشارہ موجودہ جنگ کے نتائج کی طرف ہے ﴿ذٰلِكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۸﴾﴾ میں یہ بتایا ہے کہ اب ان کی جنگ جاری تو رہے گی لیکن اللہ تعالیٰ اس کو کمزور کر دے گا یعنی آہستہ آہستہ یہ خود رک جائیں گے۔

1219- کفار جب مکہ سے چلے تو استار کعبہ کو پکڑ کر یہ دعا کی [اَللّٰهُمَّ انْصُرْ أَعْلَى الْجُنْدَيْنِ وَأَهْدَى الْفِئَتَيْنِ وَأَكْرَمَ الْحِزْبَيْنِ] (تفسير البغوى) ''اے اللہ دونوں لشکروں میں سے اعلیٰ لشکر کو اور دونوں جماعتوں میں سے زیادہ ہدایت والی جماعت کو اور دونوں گروہوں میں سے زیادہ معزز گروہ کو مدد دے۔'' بعض روایتوں میں ہے کہ **ابو جہل نے میدان جنگ میں یہ دعا کی تھی** کہ جو ہم دونوں فریق میں سے فساد اور قطع رحمی کا مرتکب ہے اس کو ہلاک کر دے۔ انہی دعاؤں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا ہے کہ تمہاری اپنی دعا کے مطابق اللہ تعالیٰ نے فیصلہ دے دیا۔ اب اس فیصلہ کو تو قبول کر لو۔

1220- کفار کو نصیحت ہے کہ جنگ سے رک جاؤ تو اسی میں تمہارا فائدہ ہے اور پھر جنگ کرو گے تو اس کا نتیجہ یہی ہے کہ اور سزا بھگتو گے۔ اور یہ بھی **پیشگوئی کھلے الفاظ میں کر دی** کہ کتنے بڑے بڑے لشکر لے کر آؤ کامیاب نہ ہو گے۔ ان حالات میں جب مسلمانوں کی جمعیت ابھی تین چار سو ہے۔ کل عرب کو مخاطب کر کے یہ کہنا الٰہی طاقت کا جلوہ ہے۔ ان الفاظ کی صداقت روز روشن کی طرح چمکی۔ جس سے کوئی دشمن بھی انکار نہیں کر سکتا۔

1221- پچھلے رکوع کے آخر میں کفار کو صاف کہہ کر کہ تمہارے بڑے بڑے جتھے اسلام کو نیست و نابود نہ کر سکیں گے بلکہ جنگوں کا نتیجہ یہ

وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ هُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۲۱﴾

اور ان لوگوں کی طرح مت ہو جاؤ جنہوں نے کہا ہم سنتے ہیں اور وہ قبول نہیں کرتے۔

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۲۲﴾

اللہ کے نزدیک سب جانداروں سے بدتر وہ بہرے گونگے ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ (1222)

وَ لَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ؕ وَ لَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّ هُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۳﴾

اور اگر اللہ ان میں بھلائی جانتا تو ان کو سناتا اور اگر ان کو سنائے تو وہ پھر جائیں اور وہ منہ پھیرنے والے ہوں۔ (1223)

ہوگا کہ تم کو سزا ملے گی اور مسلمانوں کو بتا کر کہ اللہ ان کے ساتھ ہے یعنی وہ کامیاب اور غالب ہوں گے اس رکوع میں خود مسلمانوں کو تنبیہ کرتا ہے اور ان کو بتاتا ہے کہ یہ مت سمجھ لینا کہ بس حکومت اور بادشاہت کا مل جانا اور دشمنوں کا ناکام ہو جانا ہی فلاح ہے بلکہ تمہاری حقیقی فلاح اللہ اور رسول کے احکام کی پابندی میں ہے۔ ہماری موجودہ حالت کے لیے ہدایت ہے۔

﴿لَا تَوَلَّوْا عَنْهُ﴾ یہاں ضمیر اس امر کی طرف ہے جس پر فعل اطاعت دلالت کرتا ہے یعنی اللہ اور رسول کی اطاعت سے روگردانی نہ کرو۔ درحقیقت ظاہر میں تو صرف رسول کی ہی اطاعت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے پیغام بھی وہی پہنچاتا ہے اس لیے اگر ضمیر صرف رسول کی طرف ہو تو بھی حرج نہیں۔ یا چونکہ دوسرے رنگ میں رسول کی اطاعت بھی آخر اللہ کی اطاعت ہی ہے اس لیے اللہ کی طرف ضمیر لے لی جائے تو بھی حرج نہیں۔

1222 - **عقل اور مذہب:** یہاں سے معلوم ہوا کہ قرآن شریف کی اصطلاح میں بہرے اور گونگے وہ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ بعض پیشوایان دین علی الاعلان کہہ رہے ہیں کہ عقل کو مذہب میں کیا دخل ہے؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو انسان ہو کر عقل سے کام نہ لے وہ چارپایوں بلکہ کیڑے مکوڑوں سے بھی بدتر ہے۔ اور یہ ظاہر بھی ہے کیونکہ ان کو اللہ تعالیٰ نے عقل نہیں دی ہے، اس لیے انسان جس کو وہ نعمت ملی ہے جب اس سے فائدہ نہیں اٹھاتا تو ان سے بدتر ہوا۔

1223 - **حالت عناد:** وہ لوگ جو عقل سے کام نہیں لیتے وہ خیر سے خالی ہیں۔ سننے سے فائدہ تب ہوتا ہے جب انسان اس پر غور کرے یعنی عقل سے کام لے مگر وہ چونکہ غور نہیں کرتے اس لیے ان کا سننا نہ سننا برابر ہے۔ یہ ان کی حالت واقعی کا اظہار ہے۔ اس کے بعد ان کی حالت عناد کا ذکر کیا کہ انہوں نے نہ صرف اپنے آپ کو خیر و خوبی سے ہی محروم کر دیا ہے بلکہ حق کی عداوت میں یہاں تک ترقی کر گئے ہیں کہ اگر کلمہ حق ان کے کان میں ڈالا بھی جائے تو بوجہ عناد کے منہ پھیر لیں گے۔ غور کرنا تو ایک طرف رہا وہ اعراض کرتے ہیں۔ یعنی کچھ کی کچھ باتیں بناتے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ قَلْبِهٖ وَ اَنَّهٗٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۴﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ اور رسول کا حکم مانو جب وہ تم کو اس کام کے لیے بلاتا ہے جو تمہیں زندگی دیتا ہے۔[1224] اور جان لو کہ اللہ انسان اور اس کے دل کے درمیان حائل (ہوتا) ہے اور کہ تم اس کی طرف اکٹھے کیے جاؤ گے۔[1225]

1224 - اللہ اور رسول کی فرمانبرداری کا نتیجہ بتایا ہے کہ وہ تمہاری زندگی کا موجب ہے۔ آج مسلمان قوم جس موت کے نیچے ہے اسی کا علاج یہاں بتایا ہے۔ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو تو کوئی حکم نہیں ملا جس کی انہوں نے فرمانبرداری نہ کی ہو اور اسی لیے وہ ایک زندہ قوم تھے۔ مگر آج اسلام کا دعویٰ کرنے والے اللہ اور رسول کی فرمانبرداری سے باہر نکلے ہوئے ہیں۔ انہی کو یہ **زندگی کا پیغام** دیا ہے کیا مسلمان اس پر توجہ کریں گے؟ ان کی زندگی حکومت و بادشاہت سے نہیں بلکہ اللہ اور رسول کی فرمانبرداری سے ہے۔ حکومت و بادشاہت تو محض غلام ہیں۔

یہ بھی معلوم ہوا کہ **رسول جو مردوں کو زندہ کرتا ہے** اس سے مراد احیائے روحانی ہی ہوا کرتا ہے۔ پس اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے مردے زندہ کیے تو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس سے لاکھوں درجہ بڑھ کر مردے زندہ کیے۔

1225 - يَحُوْلُ۔ حَوْلَ کے معنی ایک چیز کا تغیر اور اس کا دوسرے سے الگ ہو جانا ہیں اور حال کا صلہ جب بَيْنَ ہو تو مراد ان دونوں کے درمیان آ جانا ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے انسان اور اس کے قلب کے درمیان حائل ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ اس سے سب سے زیادہ قریب ہے۔ یہاں تک کہ قلب انسان اور انسان جن میں کوئی فرق نہیں ان دونوں کے درمیان بھی اللہ تعالیٰ حائل ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ﴿وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ﴿۱۶﴾﴾ [قٓ: 16:50] یعنی ہم انسان کی رگ حیات سے بھی زیادہ اس سے قریب ہیں۔ حالانکہ رگ حیات سے ہی انسان کی زندگی ہے۔ اور اللہ کے قریب ہونے کی طرف اس لیے توجہ دلائی کہ پھر اس کو چھوڑ کر دوسری طرف کیوں جاتا ہے؟ یا یہ فرمانبرداری میں جلدی کرنے کے لیے ترغیب ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ مہلت جو انسان کو دی گئی ہے انسان کے ہاتھ سے نکل جائے اور یہ بھی صحیح ہے کہ قلب انسانی اللہ تعالیٰ کے تصرف میں ہے اس کے عزائم بعض وقت رکھے کے رکھے رہ جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنی کسی مصلحت سے ان کو فسخ کر دیتا ہے۔ اس لیے انسان کو جب نیکی کا موقعہ ملے اس سے فوراً فائدہ اٹھائے۔ ایسا نہ ہو کہ نیکی کو ترک کرتے کرتے اس کے قلب کی حالت یہاں تک پہنچ جائے کہ پھر وہ نیک تحریک ہی اس کے اندر نہ ہو۔ اور یا مراد یہ ہے کہ تم اگر فرمانبرداری کرو تو تمہارے ضعف کو اللہ تعالیٰ قوت سے بدل دے گا اور بزدلی کی جگہ تم میں ہمت پیدا کر دے گا اور خوف کی جگہ امن دے دے گا۔

وَ اتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۵﴾

اور اس عظیم الشان فتنہ سے بچاؤ کرلو جو خاص کر ان لوگوں کو نہ پہنچے گا (مگر) جو تم میں سے ظالم ہیں اور جان لو کہ اللہ (بدی کی) سزا دینے میں سخت ہے۔ (1226)

وَ اذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَ اَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَ رَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۲۶﴾

اور یاد کرو جب تم تھوڑے تھے زمین میں کمزور تھے ڈرتے تھے کہ لوگ تم کو زبردستی پکڑ نہ لے جائیں، سو اس نے تم کو پناہ دی اور اپنی نصرت کے ساتھ تمہاری تائید کی اور تم کو اچھی چیزوں سے رزق دیا تاکہ تم شکر کرو۔ (1227)

1226 - فِتْنَةً سے مراد دکھ یا عذاب ہے اور تنوین اس کی عظمت کے لیے ہے۔ جیسا سیاق عبارت سے ظاہر ہے۔ اس میں مسلمانوں کو تنبیہ کی ہے کہ بعض وقت جب ایک قوم میں کثرت سے لوگ مستحق عذاب ہو جاتے ہیں تو پھر وہ دکھ ساری قوم کو ہی پہنچ کر رہتا ہے۔ یعنی ظالموں کے ساتھ اچھے بھی پھر اس لپیٹ میں آ جاتے ہیں۔ حدیثوں میں مسلمانوں پر آخری زمانہ میں اسی قسم کے فتنوں کے آنے کا ذکر آتا ہے جو ساری مسلمان دنیا میں عام ہو جائیں گے اور کوئی شخص ان کو روک نہ سکے گا اور ایک طرف اس کو روکنے کی کوشش کی جائے گی تو دوسری طرف سے نمودار ہو جائے گا۔

1227 - يَتَخَطَّفَكُمُ۔ خَطَفَ اور اِخْتِطَافٌ کے معنی ہیں تیزی سے کسی چیز کا لے لینا ﴿يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ﴾ [البقرة: 20:2] ''قریب ہے کہ بجلی ان کی نظر کو اچک لے جائے۔'' ﴿اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ﴾ [الصافات: 10:37] ''سوائے اس کے جو ایک (آدھ) دفعہ اچک لے جائے۔'' اور ﴿يُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ﴾ [العنكبوت: 67:29] ''لوگ ان کے اردگرد سے اچک لیے جاتے ہیں۔'' میں معنی کیے ہیں لوگ قتل کیے جاتے ہیں اور گرفتار کیے جاتے ہیں۔ (غ) یہی معنی یہاں ہیں۔

اٰوٰی - اَوَی کے معنی ہیں ایک چیز کے ساتھ مل گیا یعنی اس کی پناہ لی اور اٰوٰی کے معنی اسے پناہ دی اور اَوَی کے معنی رَجَعَ یعنی لوٹ آیا بھی آتے ہیں۔ ﴿اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ﴾ [الكهف: 10:18] ''جب ان نوجوانوں نے غار میں پناہ لی۔'' ﴿اٰوٰى اِلَيْهِ اَخَاهُ﴾ [يوسف: 69:12] ''اس نے اپنے بھائی کو اپنے پاس جگہ دی۔'' ﴿وَ تُؤْوِيْٓ اِلَيْكَ مَنْ تَشَآءُ﴾ [الأحزاب: 51:33] ''اور جسے چاہے اپنے پاس جگہ دے۔'' اور اسی سے مَأْوٰی ہے جو مصدر بھی ہو سکتا ہے جیسے ﴿جَنَّةُ الْمَاْوٰى﴾ [النجم: 15:53] ''جنت جو اصل ٹھکانا ہے۔'' اور اسم مکان بھی جیسے ﴿مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ﴾ [بنی إسرائيل: 97:17] ''ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔'' (غ)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ وَ تَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۷﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ اور رسول کی خیانت نہ کرو اور (نہ) اپنی امانتوں میں خیانت کرو حالانکہ تم جانتے ہو۔ (1228)

وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۸﴾ ع 3 9 17

اور جان لو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد آزمائش ہے اور یہ کہ اللہ کے ہاں بھاری اجر ہے۔ (1229)

ساتھ ہی اس فتنۂ عظیم میں ایک خوشخبری بھی دی ہے کہ اگر تم اس وقت کمزور ہو گے تو پھر اس وقت کو بھی یاد کرو جب تم تھوڑے بھی تھے اور کمزور بھی۔ یعنی اسلام کی ابتدائی حالت اور ایک وقت تو تمہاری حیثیت اسی قدر تھی کہ لوگ اگر زبردستی تم کو پکڑ کر ہلاک کر دیتے تو تمہارے بس کی بات نہ تھی۔ پس اگر اس وقت بھی تم کو اللہ نے مصائب سے پناہ دی اور اپنی نصرتوں سے تم کو مضبوط کر دیا تو اب ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہو کر تم کیوں مایوس ہوتے ہو؟

1228 - اللہ اور رسول کی خیانت یہ ہے کہ ان کی فرمانبرداری کا اقرار کر کے، مسلمان کہلا کر پھر ان کی فرمانبرداری نہ کریں۔ خیانت نقض عہد کا نام ہے [دیکھو نمبر: 726] یا یہ کہ وہ کام کریں جس سے دین اسلام کو اور قوم مسلمان کو نقصان پہنچتا ہو کیونکہ دین ایک امانت تھی جو ان کے سپرد کی گئی تھی۔ مسلمانوں میں یہ خیانت ہی آج کل ان کی بڑی تباہی کا موجب ہو رہی ہے۔ قومی اور دینی اغراض کو اپنی ذاتی اغراض پر قربان کر دیتے ہیں۔ چند پیسوں کے لیے قوم اور دین کو نقصان پہنچانے کے کام کر لیتے ہیں۔ ایک ادنیٰ خواہش کے سامنے اپنے اعلیٰ فرائض کو برباد کر دیتے ہیں۔ ایمان فروشی اور قوم فروشی ان کا عام شیوہ ہو گیا ہے۔ بڑی بڑی سلطنتیں اسی سے تباہ ہوئیں کہ ایک شخص نے چند پیسے اپنی جیب میں ڈالنے کے لالچ سے اغراض قومی کو دوسری قوموں کے ہاتھ بیچ دیا۔ گویا اس حصہ آیت میں اغراض قومی اور اغراض دینی کو مقدم کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ یہ قومی ترقی کا راز ہے۔ اپنی امانتوں میں خیانت یہ ہے کہ جو قویٰ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دیئے ہیں ان کو اپنے محل اور موقع پر کام میں نہ لائے اور خداداد طاقتوں کو بیکار کر دے۔ یہ انسانی یعنی افراد قومی کی ترقی کا راز ہے۔ جب تک مسلمان اندرونی اصلاح سے کام کو شروع نہ کریں گے ان کی سوراج اور حکومت حاصل کرنے کی خواہشات کا حشر بھی ناکامی کے رنگ میں ہوگا۔ اصل بیماری جب تک دور نہ ہو بادشاہت سے کیا ملے گا۔

1229 - مال اور اولاد مسلمانوں کے لیے فتنہ ہو گئے ہیں۔ اس لیے کہ انہوں نے اسی کو غرض زندگی سمجھ لیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا اسی قدر فرض ہے کہ اپنے لیے کچھ مال کما لیں یا جمع کر لیں اور اپنی اولاد کا کچھ فکر کر لیں اور اغراض قومی اور اغراض دینی کی اہمیت کو کچھ نہیں سمجھا۔ اس لیے سزا بھی اسی مال اور اولاد پر ہی آ کر پڑی۔ یعنی قوموں میں مفلس قوم رہ گئے اور اولاد دوسروں کی محکوم ہو گئی۔ وہ مال جس کو غرض زندگی سمجھا جاتا تھا وہ بھی جاتا رہا اور وہ اولاد بھی ذلیل ہوئی جس کو مدنظر رکھ کر فرائض اعلیٰ کو ترک کر دیا تھا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّ يُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۹﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تم اللہ کا تقویٰ کرو تو وہ تمہارے لیے (حق و باطل میں) فرق کر دے گا اور تمہاری برائیاں تم سے دور کر دے گا اور تمہاری حفاظت کرے گا اور اللہ بڑے فضل کا مالک ہے۔ (1229)ل

وَ اِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ؕ وَ يَمْكُرُوْنَ وَ يَمْكُرُ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿۳۰﴾

اور جب وہ جو کافر ہوئے تیرے متعلق تدبیریں کرتے تھے تا کہ تجھے قید کریں یا تجھے قتل کریں یا تجھے نکال دیں اور وہ تدبیریں کرتے تھے اور اللہ بھی تدبیر کرتا تھا اور اللہ بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔ (1229)ب

1229ل- ایک فرقان ظاہری تو وہ تھا جو جنگ بدر کے ذریعہ سے مسلمانوں کو عطا ہوا۔ یہاں اس دوسرے فرقان کا ذکر ہے جو اندرونی طور پر مومن کو عطا ہوتا ہے۔ یعنی اس کے اندر ایک ایسا نور پیدا کر دیا جاتا ہے جس سے اسے دوسروں سے امتیاز مل جاتا ہے۔ ظاہری فرقان یا فتوحات تب ہی مفید ہو سکتی ہیں جب اصلی فرقان یعنی اندرونی نور پیدا ہو۔

1229ب- يُثْبِتُوْكَ۔ ثِبَاتٌ، زَوَالٌ کی ضد ہے۔ اور ثَابِتٌ، بَصَرٌ سے بھی ہوتا ہے اور بَصِيْرَةٌ سے بھی اور بَصِيْرَةٌ کے لحاظ سے ہی کہا جاتا ہے کہ فلاں امر ثابت ہے اور يُثْبِتُوْكَ کے معنی ہیں تجھے قید کر دیں اور حیران کر دیں۔ (غ) گویا اَثْبَتَهٗ کے معنی ہیں اسے ایک مکان میں قائم کر دیا جس سے وہ علیحدہ نہ ہو سکے اور اس حالت پر بھی اَثْبَتَ بولا جاتا ہے جب بیماری یا زخم سے ایک شخص حرکت کے قابل نہ رہے۔ (ل) پس يُثْبِتُوْكَ کے معنی دونوں طرح ہو سکتے ہیں قید کر دیں یا ایسا زخمی کر دیں کہ حرکت کے قابل نہ رہے۔ مگر پہلے معنی قابل ترجیح ہیں۔ اس لیے کہ ایک روایت میں آتا ہے کہ ان میں سے بعض نے کہا [اَثْبِتُوْهُ بِالْوَثَاقِ] (ل)

اس میں مسلمانوں کی تکلیفوں کا وہ نقشہ کھینچا ہے جب خود رسول اللہ ﷺ کو بھی کہیں امن نہ ملتا تھا اور **دارالندوہ میں اکٹھے ہو کر کفار نے مختلف تجویزیں آپ کے متعلق کیں**۔ یہ کہ آپ کو قید کر دیا جائے یا قتل کر دیا جائے یا نکال دیا جائے۔ باقی تجویزیں رد ہو کر آخر اس بات پر اتفاق ہوا تھا کہ آپ ﷺ کو قتل کیا جائے۔ اس کے بالمقابل فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بھی تمہارے بچانے کے لیے ایک تدبیر کی اور وہی تدبیر کارگر ہوئی۔ ایک طرف سارے اہل مکہ کی متفقہ تدبیر، دوسری طرف ایک اکیلے انسان کو بغیر سروسامان کے ان کے اندر سے نکال کر اور انہی کے گھر کے پاس رکھ کر بچایا جاتا ہے۔ ﴿خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ﴾ مکر کے معنی مخفی تدبیر اچھی ہو یا بری [نمبر: 443] میں بیان ہو چکے ہیں۔ یہاں صرف اس قدر ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ لفظ خیر کا مکر کے ساتھ آنا خود

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَاۙ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۱﴾

اور جب ان پر ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں کہتے ہیں ہم نے سن لیا۔ اگر ہم چاہیں تو اس کی مثل کہہ لیں۔ یہ کچھ نہیں مگر پہلوں کی کہانیاں ہیں۔

وَ اِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۲﴾

اور جب انہوں نے کہا اے اللہ اگر یہ تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا ہم پر دردناک عذاب بھیج۔ (1229)ج

وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِيْهِمْ ۚ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿۳۳﴾

اور اللہ ایسا نہ تھا کہ ان کو عذاب دیتا حالانکہ تو ان میں تھا۔ اور اللہ ان کو عذاب دینے والا نہ تھا حالانکہ وہ استغفار کرتے ہوں۔ (1229)د

بتاتا ہے کہ مَاکِر میں بجائے خود کوئی شر یا برائی نہیں کیونکہ بری چیز پر خیر کا لفظ بولا ہی نہیں جا سکتا۔

1229ج- جب ان سے پہلوں کا ذکر کیا جاتا ہے جسے وہ کہانیاں قرار دیتے ہیں اور ان کی مخالفت حق کا انجام بتایا جاتا تو پھر یہ کہتے کہ اگر محمد رسول اللہ ﷺ حق پر ہیں تو ہم پر ایسا ہی عذاب کیوں نہیں آتا۔ بدر میں بھی ان کا اس قسم کی دعا کرنا ثابت ہے۔ [دیکھو نمبر: 1219]

1229د- **کفار پر تاخیر عذاب کی وجہ:** بتایا ہے کہ عذاب تو تم پر آنا ہی ہے۔ مگر اس وقت کس طرح آتا جب محمد رسول اللہ ﷺ ابھی تمہارے درمیان موجود تھے۔ سنت اللہ عذاب کے متعلق یہی ہے کہ جب نبی قوم سے الگ ہو جاتا ہے تب عذاب آتا ہے۔ پس اہل مکہ پر عذاب ضروری تھا کہ ہجرت نبی کریم ﷺ کے بعد آتا۔ دوسری وجہ یہ دی ہے کہ ابھی وہ استغفار کرتے تھے یعنی گو بظاہر عناد کی حالت میں عذاب تک مانگ لیتے تھے مگر پھر پچھتاتے تھے اور گھروں میں جا کر استغفار بھی کرتے تھے۔ لیکن جب آخر مقابلہ پر نکل کھڑے ہوئے اور تلوار ہاتھ میں لے لی کہ مسلمانوں کو بالکل نیست و نابود کر دیں تو وہ حالت استغفار پھر باقی نہ رہی۔ اور یا ﴿هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ﴾ میں اشارہ مسلمانوں کے استغفار کی طرف ہے کہ جب ان میں ایک قوم استغفار کرنے والی تھی تو عذاب ان پر کس طرح آتا؟

وَ مَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَ هُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ مَا كَانُوْۤا اَوْلِيَآءَهٗ ؕ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗۤ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۴﴾

اور اُن کا کیا عذر ہے کہ اللہ ان کو عذاب نہ دے اور وہ مسجد حرام سے روکتے ہیں اور وہ اس کے متولی نہیں۔ اس کے متولی سوائے متقیوں کے اور کوئی نہیں ہو سکتے لیکن ان میں سے بہت نہیں جانتے۔ (1229)ہ

وَ مَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّ تَصْدِيَةً ؕ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۵﴾

اور ان کی نماز خانہ (کعبہ) کے پاس سوائے سیٹیاں بجانے اور تالیاں پیٹنے کے اور کچھ نہیں۔ سو عذاب چکھو اس لیے کہ تم کفر کرتے تھے۔ (1229)و

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ

وہ جو کافر ہیں اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں

1229ہ- یعنی عذاب کا آنا تو اس لیے ضروری ہے کہ وہ حق کی مخالفت کو ترک نہیں کرتے اور مسجد حرام سے مسلمانوں کو روکتے ہیں۔ حالانکہ بوجہ اپنے مشرک ہونے کے وہ ولایۃ مسجد حرام کے مستحق بھی نہیں۔ کیونکہ مسجد تو توحید کا گھر ہے اور وہی لوگ اب اس کے اولیاء قرار پائیں گے جو مذہب توحید رکھتے ہیں یعنی اہل اسلام۔ متقیوں سے مراد یہاں شرک سے بچنے والے لوگ ہیں بمقابلہ ان مشرکوں کے جن کا ذکر ہے اور یہی ادنیٰ مرتبہ اتقاء بھی ہے۔ اس میں **یہ پیشگوئی بھی ہے کہ اہل اسلام ہی آئندہ خانہ کعبہ کے متولی رہیں گے۔**

1229و- مُكَآءً۔ مُكَآ پرند کی آواز نکالنے پر بولا جاتا ہے۔ (غ) اور سیٹی بجانے پر بھی۔ (ل)

تَصْدِيَةً۔ صَدَی وہ آواز ہے جو صاف مکان سے لگ کر واپس آتی ہے یعنی گونج اور تَصْدِيَةً وہ آواز ہے جو اس کے قائم مقام ہو یعنی جس میں کچھ فائدہ نہ ہو۔ (غ)

مشرکین عرب کی عبادت کا رنگ:

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ مشرک حج کے وقت ننگے ہو کر خانہ کعبہ کا طواف کرتے اور سیٹیاں اور تالیاں بجاتے تھے۔ یا اشارہ ان کے ان افعال کی طرف ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عبادت سے روکنے کے لیے کرتے تھے۔ گویا ان کی عبادت اب اسی قدر رہ گئی ہے کہ سیٹی اور تالیاں بجا کر دوسروں کی عبادت میں مخل ہوں۔ راغب کہتے ہیں کہ مراد یہ ہے کہ ان کی نماز یا دعا میں حقیقت کچھ نہیں، ایسی ہے جیسے سیٹی یا تالی یعنی بے معنی حرکت یا آواز۔

لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَسَيُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ ؕ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ يُحْشَرُوْنَ ۙ﴿۳۶﴾

تاکہ اللہ کی راہ سے روکیں۔ سو ان کو خرچ کرتے رہیں گے پھر وہ ان کے لیے پچھتاوا ہوں گے۔ پھر وہ مغلوب کیے جائیں گے۔ اور جو کافر ہیں وہ جہنم کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے۔ (1229)ز

لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَ يَجْعَلَ الْخَبِيْثَ بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ فَيَرْكُمَهٗ جَمِيْعًا فَيَجْعَلَهٗ فِيْ جَهَنَّمَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ ع 4 9 18

تاکہ اللہ پاک کو ناپاک سے الگ کر دے اور ناپاک کو ایک دوسرے پر رکھتا چلا جائے پھر سب کو ایک ڈھیر بنا دے پھر اس کو جہنم میں ڈال دے وہی نقصان اٹھانے والے ہیں۔ (1229)ح

1229ز- یہاں بتایا ہے کہ مسلمانوں سے ان کو عداوت اور کسی وجہ سے نہیں بلکہ محض اس لیے کہ وہ مسلمانوں کے دین کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ جنگ بدر میں بھی اگرچہ عام لوگوں کو اس بنا پر اکسایا گیا تھا کہ ابن حضرمی کو مسلمانوں نے قتل کر دیا ہے مگر اصل کینہ یہی تھا کہ مسلمان ترقی کرتے جا رہے ہیں ایسا نہ ہو کہ زور پکڑ جائیں تو پھر ان کا تباہ کرنا مشکل ہو جائے اور ابن حضرمی کا قتل محض ایک بہانہ بنایا گیا تھا۔ **ابن حضرمی کے قتل کا واقعہ اتفاقی تھا** اور وہ اس طرح پر تھا کہ آنحضرت ﷺ نے عبداللہ بن جحش کی سرداری میں کچھ آدمی قریش کے حالات معلوم کرنے کے لیے بھیجے تھے۔ غرض یہ تھی کہ ان کی تیاریٔ جنگ کا حال معلوم رہے اور تحریری پروانہ میں صرف اسی قدر ہدایت تھی کہ نخلہ تک جاؤ اور قریش کی خبر لاؤ۔ ان لوگوں نے غلطی سے ابن حضرمی کو جو اس وقت ایک قافلہ کو لیے ہوئے طائف سے آ رہا تھا قتل کر دیا۔ ایسے اتفاقی قتلوں میں عرب میں دستور دیت کا تھا مگر ابوجہل نے اسے بہانہ بنا کر مدینہ پر چڑھائی کی۔ سات سو اونٹ اور تین سو گھوڑے اس لشکر کے لیے تیار کیے جس پر بہت سا مال خرچ ہوا۔

جنگ بدر کے بعد اور لڑائیاں اور ان میں کفار کی مغلوبیت کی پیشگوئی:

مگر علاوہ اس کے یہاں آئندہ کے لیے بھی پیشگوئی ہے کہ ابھی یعنی جنگ بدر کے بعد اور مال بھی اسلام کی مخالفت پر خرچ کریں گے مگر چونکہ ناکام رہیں گے اس لیے یہ خرچ ان کے لیے موجب حسرت رہے گا اور صرف مسلمانوں پر چڑھائی میں ہی ناکام نہ رہیں گے بلکہ آخر کار مسلمانوں سے مغلوب بھی ہو جائیں گے۔ جنگ بدر کے بعد بھی ایسی صریح پیشگوئی قیاس انسانی سے بالکل بالاتر تھی اس لیے کہ ان کی طاقت ابھی اسی طرح باقی تھی اور مسلمانوں کی تعداد تین چار سو سے زائد نہ تھی جو میدان جنگ میں لائی جا سکتی۔

1229ح- الْخَبِيْثَ۔ الطَّيِّبِ۔ خبیث اور طیب کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 82 ،343] اور الْخَبِيْثَ اور الطَّيِّبِ سے برے اور اچھے

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ وَ اِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۸﴾

ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا' کہہ دو! اگر وہ رک جائیں تو جو گزر چکا ان کو معاف کر دیا جائے گا' اور اگر وہی کام پھر کریں تو پہلوں کا معاملہ گزر ہی چکا ہے۔ (1229)ط

وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا

اور ان کے ساتھ جنگ کرو یہاں تک کہ (دین کے لیے) دکھ دینا نہ رہے اور دین سب کے سب اللہ کے لیے ہوں پھر اگر وہ رک جائیں

عمل بھی مراد ہو سکتے ہیں اور برے اور اچھے نفوس بھی یا کافر و مومن۔ (غ) اور انسانوں میں طیب وہ ہے جو جہل اور فسق اور برے اعمال سے پاک ہو اور علم اور ایمان اور اچھے اعمال کے ذریعہ سے آراستہ ہو۔ (غ)

يَرْكُمُ۔ رَكْم کے معنی ہیں ایک چیز کو دوسرے کے اوپر رکھ کر جمع کرتا چلا گیا ﴿سَحَابٌ مَّرْكُوْمٌ﴾ [الطور: 44:52] ''تہ بتہ بادل ہیں۔'' اور رُكَامٌ وہ ہے جو ایک دوسرے پر رکھ کر جمع کیا جائے ﴿ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا﴾ [النور: 43:24] ''پھر اسے تہ بتہ کرتا ہے۔''

یہاں ان کے مغلوب ہونے کا نتیجہ بتایا یعنی تا کہ پاک اور ناپاک الگ الگ ہو جائیں۔ خبیث اور طیب انسانوں پر بھی بولے جا سکتے ہیں اور مال وغیرہ پر بھی۔ اگر انسان مراد ہوں تو مطلب یہ ہے کہ اس مغلوبیت پر کافروں اور مسلمانوں میں ایک کھلا کھلا امتیاز قائم ہو جائے گا اور ائمۃ الکفر یکے بعد دیگرے جہنم میں پہنچ جائیں گے۔ یا ان کے لشکر یکے بعد دیگرے آتے رہیں گے مگر نتیجہ سب کا ناکامی ہوگا یہی ان کا جہنم ہے۔ اور اموال مراد ہوں تو مطلب یہ ہے کہ مومنوں اور کافروں کے خرچ کیے ہوئے مال میں تمیز ہو جائے گی ایک کا مال خرچ کیا ہوا کامیابی کا موجب ہوگا، دوسرے کا ناکامی کا موجب۔ آیت کے آخری الفاظ پہلی صورت کو مرجح ٹھہراتے ہیں۔

1229ط- اس رکوع میں یہ دکھایا ہے کہ جنگ بدر میں مسلمانوں کا دشمن کے مقابلہ میں نکلنا محض مصلحت الٰہی سے عمل میں آیا ورنہ اگر کفار کی طاقت کا اندازہ ان کو ہوتا تو وہ جرأت نہ کرتے۔ اور ایسا اس لیے ہوا کہ تا اللہ تعالیٰ ایک کھلا ثبوت حقانیت اسلام کا دے اور حق و باطل میں کھلا کھلا فیصلہ کر دکھائے۔

سُنَّتٌ کے معنی طریق ہیں ﴿سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ﴾ سے مراد وہ طریق ہے جو پہلے سرکش لوگوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے برتا یعنی مراد پہلوں کا قائم کردہ طریق نہیں بلکہ وہ طریق ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے خلاف قائم کیا یعنی جس طرح ان کو سرکشی کی سزا دی اسی طرح تمہیں بھی دے گا۔

فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿٣٩﴾

تو اللہ اس کو دیکھ رہا ہے جو وہ کرتے ہیں۔ (1230)

وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ؕ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَ نِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿٤٠﴾

اور اگر پھر جائیں تو جان لو کہ اللہ تمہارا مولیٰ ہے کیا ہی اچھا مولیٰ اور کیا ہی اچھا مددگار ہے۔

1230 – اس پر مفصل بحث [نمبر: 246] میں گزر چکی ہے۔ ہاں یہاں الفاظ ﴿الدِّيْنُ كُلُّهٗ﴾ قابل غور ہیں جن کے معنی ہیں ''سب دین۔'' جیسے ﴿لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ [التوبة: 33:9] ''تاکہ اس کو کل دینوں پر غالب کرے۔'' میں **الدِّيْنِ كُلِّهٖ سے مراد سب دین ہیں**۔ سب دینوں کا اللہ کے لیے ہونا یہی ہے کہ جو دین کوئی چاہے اختیار کرے، کسی ایک دین پر مجبور نہ کیا جائے۔ یہ عین اس کے مطابق ہے جہاں دوسری جگہ اسلامی جنگوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر ہم ایسی اجازت نہ دیتے تو گرجے اور راہبوں کی کوٹھڑیاں اور دوسرے مذاہب کے عبادت خانے سب تباہ ہو جاتے۔ گویا وہاں بھی سب مذاہب کی حفاظت اسلامی جنگوں کی غرض بتائی ہے اور یہاں بھی۔